مسلم بنگالی ادب

مُسلم بنگالی ادب

ڈاکٹر انعام الحق ایم۔اے، پی ایچ ڈی

کی بنگالی کتاب

مُسلم بنگلہ ساہتیہ

کا اُردو ترجمہ

ادارہ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

اپریل ۱۹۵۷ء

قیمت چار روپے

مندرجات

*

دیباچہ

ہماری قومی ثقافت کا ادبی پہلو جسے میں نے اپنی اس تالیف میں اجالنے کی کوشش کی ہے مدت تک گوشۂ تاریکی میں رہا ہے ۔ گاہ گاہ اتنا تو ہوا کہ کسی صاحب نے تحقیق کا چراغ لے کر ہمیں اس قصر معلیٰ کی ایک دو جھلکیاں دکھائیں لیکن تاریکی کا نقاب اس حدتک نہ ہٹا کہ اس کا نظارہ جی بھر کے کیا جا سکتا ۔

میں نے اس قصر معلیٰ کے دروازے پر مٹی کا ایک دیا رکھنے کی کوشش کی ہے ۔ میری آرزو یہ ہے کہ اگر کوئی طلب اور جستجو کا مارا مسافر اس دروازے پر پہنچے تو اس چراغ کی مدھم روشنی میں ہماری ادبی وراثت کی پرپیچ غلام گردشوں کا راستہ پا سکے ۔ یہ سوچنا تو خام خیالی ہوگی کہ اس چھوٹے سے دئے کی روشنی اس کے

بام و در روشن کرسکے گی ۔ اس کے لئے تو بیس برس کی محنت اور چاھئے ۔

ساھتیہ وشارد مرحوم عبدالکریم کی تحقیقات میری اس تالیف کے مواد کا اگر واحد نہیں تو سب سے اھم اور بڑا مأخذ ضرور ھیں ۔ اگر وہ زندہ ھوتے تو یہ دیکھہ کر خوش ھوتے کہ کس طرح میں نے ان کے دئیے سے اپنا دیا جلایا ھے ۔ ان کی اس خوشی کا خیال کر کے میری آنکھوں میں تشکر و امتنان کے آنسو آجاتے ھیں اور میں بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ھوں کہ ان کی روح کو ابدی سکون ملے ۔

اس موقع پر میں اپنے دوست مولوی عبدالقادر صاحب کا شکریہ بھی ادا کردوں ۔ اگر ان کی ترغیب و تاکید شامل حال نہ ھوتی تو شاید میں اس کام کا بیڑا نہ اٹھاتا ۔ بہر حال مجھے موضوع کے دلدادگان کی خدمت میں یہ حقیر تالیف پیش کرتے ھوئے دلی خوشی ھو رھی ھے ۔ دیکھیں ان کے معیار نظر پر یہ کہاں تک پوری اترتی ھے ۔

محمد انعام الحق

چاٹگام کالج ۔ چاٹگام

باب اول

بنگال اور مسلمان

سر زمین بنگال کی معلومہ تاریخ تین ہزار سال قبل مسیح تک پہنچتی ہے - رگ وید کے جزو '' آئتاریہ آر نیا ک '' میں اس دیش کا ذکر '' ونگا ،، کے نام سے ملتا ہے - اس عہد سے ساتویں صدی عیسوی تک قدیم بنگال متعدد قبائلی خطوں میں تقسیم رہا ہے - مثلا ونگا - پنڈرا - گوڑ - راڑھ - سما - برھما - تمرا لپتی - اور سماتت - ساتویں صدی عیسوی میں راجا ششنکا نے ان تمام خطوں کو گوڑ کے نام سے ایک وحدت میں منسلک کرنے کی کوشش کی - اس وقت سے تینوں قبائلی خطے - پنڈرا گوڑ اور ونگا بنگال کے مترادف سمجھے جاتے ہیں - یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یہ قبائلی خطے ونگا نام کی وحدت

میں ہندوؤں کے عہد میں منسلک نہیں ہوئے بلکہ مسلمانوں کے عہد میں ہوئے ۔

ان کو متحد کرنے کا عمل ترکوں کے عہد میں شروع ہوا ۔ اور اس کی تکمیل مغل بادشاہ اکبر کے دور میں ہوئی ۔ اکبر کے عہد میں سارا بنگال "صوبۂ بنگالہ" کے نام سے موسوم ہوا اس کے وسیع وعریض علاقے میں اس وقت بہار اور اڑیسہ بھی شامل تھے ۔ انگریزوں کے عہد میں اس پر قطع وبرید کا عمل ہوا اور اس کی حدود بھی زیادہ قطعیت سے متعین ہوگئیں ۔ بہرحال بنگال کو متحد کرنے کا سہرا بڑی حد تک مسلمانوں کے سر ہے ۔

آئیے ایک نظر یہ بھی دیکھیں کہ لفظ "بنگلہ" کہاں سے نکلا ۔ زمانۂ قبل از تاریخ سے راجہ ششنکا کے عہد (ساتویں صدی عیسوی) تک بنگال متعدد خطوں یعنی ونگا ۔ گوڑ ۔ پنڈرا وغیرہ میں منقسم تھا ۔ سنسکرت ادب سے اس بات کی کافی شہادت ملتی ہے ۔ ان میں سے اکثر نام جغرافیائی علاقوں سے زیادہ نسلی گروہوں کی نشان دہی کرتے تھے ۔ سنسکرت کتابوں میں ونگاہ ۔ گوڑھ راڑھا، پنڈرا وغیرہ اسمائے جمع جو فی الحقیقت نسلی گروہوں کے نام ہیں، اکثر اوقات جغرافیائی علاقوں کے لئے

بھی استعمال ہوتے ہیں ۔ اب یہ ایک سادہ امر ہے کہ لفظ
'' ونگا '' دراصل '' ونگاجن '' (بنگالی لوگ) کا قائم مقام ہے اور لفظ
'' گوڑ گوڑجن '' (گوڑ کے باشندگان) کا ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے
کہ وہ مقام جہاں ونگا قبیلے کے لوگ رہتے تھے اسی نام سے
موسوم تھا ۔ لیکن سنسکرت لفظ ونگا اصل میں ونگ قبیلے کے
لئے تھا ۔ لفظ بنگہ اور بنگالہ اسی قبیلے کے نام پر ہیں ۔ اور
ابوالفضل نے '' آئین اکبری '' میں اس لفظ کی جو توجیہ کی ہے
وہ درست اور معقول نظر آتی ہے ۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ لفظ
ونگ کے ساتھ جب حرف ''آل'' لاحقے کے طور پر ملایا گیا تو
بنگال بنا ۔ آل سنسکرت کے لفظ ''آلی'' سے نکلا ہے جو مشرقی
بنگال میں اب بھی ''آئل'' کی صورت میں رائج ہے ۔ بنگال سے
فارسی میں بنگالہ (ملک بنگال) بن گیا اور آخر کار عام بولی
میں بنگہ استعمال ہونے لگا ۔ اس کا مطلب ہوا قبیلہ '' ونگ ''
کا وطن یا حدود ۔ ('' آلی '' کا مطلب ہے مزروعہ زمین کے گرد
مٹی کا پشتہ) آثار قدیمہ کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے
کہ قبیلہ' ونگ کا یہ وطن بھاگیرتی ندی (گنگا کی شاخ جو
بنگال میں سے گذرتی تھی) کے مشرقی ساحل سے آسام کی مغربی
سرحد تک پھیلا ہوا تھا ۔ اس کی وسعت رفتہ رفتہ کم ہوتی

گئی اور اب موجودہ مشرقی بنگال یا مشرقی پاکستان تک
محدود ہے۔ بنگالی زبان نیز عوام کی نسلی ترکیب تو زمانۂ قبل
تاریخ سے مسلمانوں کی فتح بنگال تک کے طویل عرصے میں
متعین ہوچکی تھی۔ بنگال اس وقت ایک وسیع ملک تھا جس
کی سرحدیں "اراکان" کی مغربی حدود، شمال میں ہمالیہ کے
دامن اور جنوب میں سمندر کو چھوتی تھیں۔

علم الانسان کی جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ زمانۂ
قبل از تاریخ میں اس وسیع علاقے کے باشندے پروٹو آسٹرا
لوئڈ *Proto—Austroloid* اور آلپائنس *Alpinus* کے ایک
مخلوط گروہ تھے۔

زمانۂ قبل از تاریخ ہی میں منگول خون کا مذکورہ بالا
دونوں نسلی گروہوں میں پیوند لگا۔ بنگال کے کوچ، پالی،
راج بنسی، چکمہ اور جمیا سب منگول نسل سے تعلق رکھتے
ہیں۔ بنگال میں اب بھی ان کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی سے ایک اور نسل کا خون بنگالیوں
کے خون میں شامل ہونا شروع ہوا۔ اس صدی میں بنگال میں
سامی نسل کے لوگوں کی آمد شروع ہوئی۔ [illegible]

[illegible]اہی میں حال ہی میں خلیفہ ہارون الرشید (۷۸۶ تا ۸۰۹ ع)
کے عہد کا ایک سکہ دستیاب ہوا ہے جس سے یہ بات ثابت
ہوتی ہے کہ سامی عرب اس زمانے میں بنگال میں تجارت بلکہ تبلیغ
دین بھی کرتے تھے۔ انہوں نے چاٹگام میں ایک امیر کے تحت ایک
مرکز بھی قائم کیا تھا۔ سلطان بایزید بسطامی (۸۷۴ع)
میر سید سلطان محمود ماہی سوار (۱۰۴۷ع) شاہ محمد
سلطان رومی (۱۰۵۳ع) بابا آدم شہید (۱۱۱۹ع) اور شاہ
[illegible] جیسے بزرگ اور درویش بنگال میں مسلمانوں
کی آمد آمد کے ان دنوں میں تبلیغ اسلام میں مصروف تھے۔

سامی نسل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، افریقہ کے زنگی
(نگرو) بھی اس ملک میں آئے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں
متعدد زنگی سلطان بنگال میں سریرآرائے سلطنت رہے۔ دہلی
اور آگرہ کی [illegible] میں زنگی محافظ رکھنے کی رسم اس دیار
میں بھی رائج ہوگئی تھی۔ اس طرح زنگی خون بنگالی خون
کے ساتھ آمیز ہوگیا۔ نتیجے میں بعض ایسے بنگالی نظر آتے
ہیں جن کا رنگ نہایت سیاہ، ناک چپٹی، بال گھونگھریالے
اور ہونٹ موٹے ہوتے ہیں۔ یہ اسی نسلی ترکیب کی یاد
دلاتے ہیں۔

نسلی اصطلاحات سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم یہ ماننے کو تیار ہیں کہ آج کے بنگالیوں میں آریائی ، غیر آریائی ، منگول ، سامی ، حبشی اور دیگر متعدد قوموں کا خون گردش کر رہا ہے ۔ اس مخلوط نسلی گروہ کی بولی بنگلی یا بنگلہ ہے ۔

باب دوم

بنگالی زبان

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ بنگالی ایک مخلوط نسل ہیں ۔ وہ جو زبان بولتے اور لکھتے ہیں اسکا جدید نام بنگالی ہے ۔ جس طرح تاریخی تحقیق سے جدید بنگالی قوم کی ابتدا کا حال معلوم ہوا ہے، اسی طرح جدید بنگالی زبان کے سائنسی تجزیے سے اس کی ابتدا اور اصلیت کا پتہ چلتا ہے ۔ چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بنگالی نسل کی طرح بنگالی زبان بھی کئی زبانوں کا مجموعہ ہے ۔ اگر چہ ہمارے پاس کوئی بین شہادت یا مثال تو نہیں کہ بنگالی زبان بولنے یا لکھنے کے رواج سے پہلے جو زبان یہاں بولی جاتی تھی اسکی ٹھیک ٹھیک شکل کیا تھی ، لیکن اسکی نوعیت کا تھوڑا بہت اندازہ کرنے کیلئے کافی بالواسطہ شواہد موجود ہیں ۔

سنسکرت کی کتاب '' آریہ ماں جسری مولا کلپا ،، میں جو آٹھویں صدی ہجری میں لکھی گئی، مذکور ہے کہ گوڑ اور پنڈرا کے لوگ '' اشوروں ،، کی زبان بولتے ہیں۔ اس زمانے میں مشرق مغربی

اور جنوبی بنگال شمالی بنگال کا حصہ بنڈرا اور شمال مغربی آسام کوڑ
میں شامل تھا - چنانچہ اشورا زبان بولنے والے آسام اور قدیم
بنگال کے باشندے تھے - اشورا اب بھی کولوں منڈوں اور
دوسرے نیم مہذب قبائل کی ایک بولی ہے اس لحاظ سے اسورا
"آسٹری" بولیوں میں شامل ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یاتو
اشورا یا دوئی اور آسٹری بولی بنگالی کے رواج سے پہلے بنگال
کی عام زبان تھی - اشورا زبان کے کچھ الفاظ جو بنگالی میں
اب تک رائج ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

جدید بنگالی	آسٹری صورت
کوڑی (بمعنی بیس)	دراوڑی— کوڑی
بان (بمعنی چار)	سنتھال—آوبن، بون، یا بان
گنڈا (بمعنی چار)	دراوڑی— گنڈا
وانگ (ملک کا نام)	دراوڑی- بانگ (قبیلے کا نام)
ڈھینکی (چھڑائی کرنے کی مشین، کٹڈان)	منڈا— ڈھینکی
موٹا (موٹا)	منڈا—موٹو
دا داھا—جھنڈا- بنشدہ	دولا—دا یا دوک (بمعنی بانس)
کپوتکشا (دریا کا نام)	کولا—کباڈک (سنسکرت کپوتکشی)

دامودر (دریا کا نام)　　　　کولا—دمڈگ

ڈوم (ہندوؤں کی ایک نیچ ذات)　　　　دروازی—بندرا

اس کے علاوہ بول چال کی بعض خصوصیات جیسے چار اور بیس میں گنتی کرنا، "جھون جھون" "کھون کھون" کی طرح کے الفاظ کا استعمال جو نقل صوت کے طور پر بولے جاتے ہیں۔ جملہ اور زبان کی بعض خصوصیات جیسے ایک ہی لفظ کا مختلف مخاطب کے لئے استعمال، ایسی خصوصیات ہیں جن سے بنگالی زبان میں غیر آریائی میل ظاہر ہوتا ہے۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ بنگالی میں ایک بڑی بھاری تعداد عربی فارسی پرتگالی اور انگریزی الفاظ کی بھی ہے۔ خالص سنسکرت کے الفاظ پچیس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔ باقی الفاظ یا تو "پراکرت" یا "اپ بھرنش" کے ہیں۔ اس کا فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ قدیم بنگال کی اشورا زبان کیسی تھی اور جدید بنگالی میں سے کیونکر کم و بیش غائب ہو گئی۔ مگر اس بارے میں بعض قیاسات ضرور کئے جا سکتے ہیں۔

مہاستھان، ضلع بوگرہ کا ایک سنگی کتبہ قدیم بنگال کی آریائی زبان کی واحد مثال ہے جو قدیم مگدھی یا مشرقی

پراکرت سے بہت قریب تھی ۔ قدیم آریائی بولی پراکرت ہے ۔
اس کے بعد اس نے مختلف زبانوں کے روپ دھار لئے ۔ قدیم مگدھ میں
جو زبان رائج تھی اسے مشرقی پراکرت کہتے ہیں جس زبان کو
"ڈانڈی" نے گوڑی پراکرت کا نام دیا ہے وہ مشرقی پراکرت ہی
کی ایک قسم ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں اور یہ دور تر مشرقی علاقے
میں بولی جاتی تھی ۔ ماہرین لسانیات کا قطعی فیصلہ ہے کہ جدید
بنگالی مگدھی پراکرت یعنی گوڑی پراکرت ہی کی ترقی یافتہ
شکل تھی یعنی یہ براہ راست سنسکرت سے ماخوذ نہیں ۔

نتیجہ یہ کہ بنگالی زبان کا ماخذ وہی پراکرت ہے جس
سے اردو ، پنجابی ، سندھی اور برعظیم پاکستان و بھارت کے شمالی
اور مغربی علاقوں کی دوسری زبانیں پیدا ہوئیں ۔

باب سوم

بنگالی زبان کے اولیں نمونے

بنگالی زبان کے پیدا ہونے کی تاریخ کا قیاس کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ زبان کے بننے میں مدتیں لگتی ہیں۔ نویں صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری کے درمیانی وقفے میں بنگالی نے بعض مستقل خصوصیات پیدا کیں۔ اس چار سوسالہ عرصے میں گویا زبان کا ''جنین،، تیار ہوا۔ اس عہد کے شروع میں سنسکرت کے علاوہ دو اور زبانیں بھی رائج تھیں۔ ایک شورسینی پراکرت یا شورسینی اپ بھرنش، اور دوسری مگدھی پراکرت یا مگدھی اپ بھرنش۔ بنگالی زبان آسی مگدھی اپ بھرنش سے نکلی۔ بنگالی کے دور تشکیل کی صرف ایک مثال ہمارے پاس موجود ہے جس کا نام ہے ''چار یا کدوا ونش کایا،،۔ اس میں آداب زیست بیان کئے گئے ہیں۔

زبان کی تحقیق سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ یہ گیت بنگالی کے دور تشکیل میں لکھے گئے۔ قواعد اور بندش بھی خالصتاً

بنگالی ھیں - وھی قواعد اور طرز بیان جدید بنگالی میں بھی موجود ھے۔ ان گیتوں میں جو محاورے استعمال کئے گئے ھیں اُن میں سے بعض اب بھی بنگالی میں رائج ھیں۔ پھر دریاؤں، کشتیوں، ڈونگوں اور مانجھیوں کے مناظر بھی دریاؤں کی سرزمین بنگال کیلئے کوئی نئی چیز نہیں - اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان میں سے زیادہ تر گیت بنگالی سادھوؤں کے لکھے ھوئے ھیں - نفس مضمون کا تعلق زھد و عبادت سے ھے - بنگالی زبان اور ادب کے ارتقا کی تاریخ میں انہیں بڑی اھمیت حاصل ھے - ان کی ادبی حیثیت بھی ایسی نہیں کہ انہیں آسانی سے نظر انداز کیا جاسکے - بعض منظومات میں جو سماں باندھا گیا ھے اس میں اب بھی بڑی چاشنی پائی جاتی ھے حالانکہ تقریباً ھزار برس گزر چکے ھیں - ایک گیت کا لفظی ترجمہ دیکھئے :

,, شاوری لڑکی اونچی پہاڑیوں پر رھتی ھے

وہ مور کا سا لباس پہنتی ھے

گنجری کی مالا گلے میں ھے

پگلے شاور اس کی خاطر فریاد نہ کر

تیری بیوی موجود ھے جس کی ادائیں بڑی سیدھی سادی ھیں

دیکھو بہت سے درختوں میں پھول آرہے ہیں
یہ نظارہ آسمانوں کو لبھاتا ہے

شاوری لڑکی بن میں اکیلی گھوم رہی ہے

کانوں میں کنڈل اور باجرا پہنے

تین پنیوں کی سیج بچھی ہے، ارے شاور، تونے خوشی
خوشی بستر بچھایا ہے

شاور سانپ کی مانند ہے۔ نراتما اسکی دھرم پتنی کی
طرح ہے۔ دونوں نے رات خوشی اور پیار میں گذاری،،۔

ان استعاروں کے گہرے معنی کچھ بھی ہوں، پہاڑی پر
رہنے والی شاوری لڑکی آج کی لڑکی سے ملتی جلتی ہے، جو شمالی
بنگال کی پہاڑیوں میں رہتی ہے۔ ہم ہرے بھرے جنگلوں
کے پس منظر میں جب اس کا تصور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے
کہ بن کے باسی بن میں خوبصورت دکھائی دیتے ہیں جیسے
بچہ ماں کی گود میں زیادہ خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ ''چار یا
چار ونش چا یا،، کے دوسرے گیت بھی ایسی ہی منظر
کشی سے مالا مال ہیں۔

بعض ''چار یا،، گیتوں میں عشق کے مضامین باندھے گئے ھیں ۔ عشق ھمیشہ سے ادب کا مرغوب موضوع ھے ۔ لیکن ان نظموں میں سب سے اھم بات ان کی موسیقی ھے۔ گنجری، وانگل ، پٹ منجری ، وراری ، دوسا کنہ ۔ دھناشی وغیرہ کچھ راگنیاں ھیں جن کی دھنیں باندھی گئی ھیں ۔ ان میٹھی دھنوں کی وجہ سے چار یا کاوا گیتوں میں پڑھنے اور سننے والوں کیلئے بڑی واضح کشش ھے ۔ بعد کے ادب پر ان کا جو اثر پڑا اور بہت اثر پڑا ، اس سے ان کی اھمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ھے ۔ بعد کی ادبی سرگرمیوں کو ان گیتوں نے کئی طرح سے متاثر کیا ۔ ان سے آنے والے مصنفوں کیلئے ایک ادبی زبان پیدا ھوئی ۔ بعد کے ادب پاروں کی زبان میں چار یا گیتوں کی زبان کے اثرات کے بہت واضح اشارے ملتے ھیں ۔ اس بات کے ثبوت میں 'شری کرشن کیرتن، کافی ھے ۔ اگر یہ کتاب نہ ملتی تو یہ جاننا ناممکن ھو جاتا کہ چار یا گیت بنگالی زبان کے دور تشکیل کی تخلیق ھیں ۔

پھر چار یا گیتوں میں بعض پہیلیاں یا رمزیں ملتی ھیں جو بعد کے لکھے ھوئے آؤل ، باؤل ، مرشدی اور معرفتی گیتوں کے ساتھ ان کی گہری مشابہت کا ثبوت ھیں اور جن میں چار یا

گیتوں کے اثرات پائے جاتے ھیں - چاریا ھی سے بنگال میں
گیت لکھنے کا رواج چلا ، اور یہ دھارا ویشوا اور ساکتا
گیتوں سے نکل کر ٹیگور اور نذر الاسلام کے گیتوں تک
پہنچا - بنگلی نظم کی بندش پر بھی چاریا کے گیتوں نے بڑا
اثر ڈالا - بعد کی پایار اور لاچاری بحریں چاپا گیتوں کی
بحر سے نکلیں - ان گیتوں میں صوتی تواتر اور قافیے ملتے
ھیں - ان میں ٹیپ بھی ھے جس میں شاعر کا نام بندھا ھوتا
ھے - گیتا گووند سے پہلے جو چاریا گیتوں کے بہت بعد
میں لکھی گئی ، ایسی کوئی نظم نہیں ملتی جس میں یہ
خصوصیات پائی جاتی ھوں - اس کے بعد کی نظموں میں البتہ
یہ خصوصیات ملتی ھیں -

چنانچہ چاریا گیتوں کو زبان کے ارتقا میں بے مثال اھمیت
حاصل رھی ھے - اگر یہ گیت نہ ملتے تو بنگلی زبان کی اصل کا
پتہ نہ چلتا -

حصّہ دوم

ترکوں کا عہد

(١٢٠١ء–١٣٥٠ء)

باب اول

ترکوں کے عہد کا سیاسی پس منظر

سنہ ۱۲۰۱ع میں ہندوؤں کا دور حکومت ختم ہوا اور اسکی جگہ مسلمانوں کی حکومت نے لی - اس ملک کے پہلے مسلمان حکمراں ترکی نسل کے تھے - ان کا مذہب اسلام تھا اور ثقافت ایرانی - اپنے گھروں میں وہ ترکی بولتے تھے - سیاسی اور سرکاری کام فارسی میں انجام پاتا تھا اور مذہبی اغراض کیلئے عربی استعمال ہوتی تھی -

لکشمن سین اگرچہ پورے بنگال کا نہیں لیکن " بنگا " کا آخری راجہ تھا - دوئی - جے دیو، اوما پتی جیسے شاعر اور ھلاید مسرا جیسے عالم لکشمن سین کے دربار کے رتن تھے - لکھنوتی یا لکشناوتی (موجودہ گوڑ کے قریب) اسکی راجدھانی تھی - اسکے دربار کے نامور شاعروں اور عالموں کی سرگرمیوں

کی وجہ سے سنسکرت کلچر کو فروغ ہوا اور ''جے دیو،، کے ''گیت گووند،، کے ذریعہ یہ کلچر تمام شمالی ہند میں پھیلا۔ تاہم یہ بات ظاہر ہے کہ اسوقت عوام کو بنگلہ زبان پڑھانے کے انتظامات موجود نہ تھے۔ سنسکرت بنگالیوں کی مانوس بولی تھی اور اسنے ایک معنی میں بنگلہ زبان کی آئندہ ترقی کی راہ ہموار کی۔

''سیکسو بدھائے،، جس کا دیباچہ ہلایدھ مسرا کا لکھا ہوا ہے اور جو شیخ جلال‌الدین تبریزی (۱۲۲۵ء) کے مقبرہ واقع پنڈوا (گوڑ سے بارہ میل دور) میں محفوظ ہے، یہ مذکور ہے کہ ترک ۱۲۰۳ء یعنی شاکا کیلنڈر کے مطابق ۱۲۲۵ میں بہار کے مشرقی علاقے تک پہنچ چکے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ۱۲۰۳ء ہی میں مشہور ترکی جنرل اختیارالدین بختیار خلجی نے لکھناوتی میں ہندو راجہ لکشمن سین کو مار بھگا یا ہو جس سے سنسکرت پر ایک ضرب کاری لگی اور بنگلہ زبان کے فروغ کی راہ کھل گئی۔ بعد میں پورا شمالی بنگال بختیار کے زیر نگیں آگیا۔

تاہم بختیار کی شمالی بنگال کی فتح کے بعد لکشمن سین کے جانشین مشرقی بنگال میں وکرم پور کے مقام پر تقریباً سوسال تک ایک چھوٹی سی ریاست پر قابض رہے۔ اس سو سال میں ۱۲۰۱ سے لیکر ۱۳۰۱ تک مسلمان حکومت بنگال میں بتدریج پھیلتی

رہی - فرید شاہ (۲۲-۱۳۰۱) نے بہار - لکھناوتی - سپتگرام اور بنگہ (سونار گاؤں) یا یوں کہئے کہ پورے بنگال اور بہار کو مسلمان قلمرو میں شامل کرلیا - اس کے عہد میں ولی شاہ جلال مجرد یمنی کے حکم سے جنرل ناصرالدین اور سکندر غازی نے سلہٹ کے ہندو راجہ گوڑ گوبند کو شکست دی اور وسیع بنگال کی مسلم سلطنت کو دریائے برھمپترا کے مشرق کنارے تک جا ملایا -

سلطان فیروزالدین شاہ کی وفات پر اسکے بیٹوں میں تخت کیلئے جنگ شروع ہوگئی جو ۱۳۲۸ء تک جاری رہی - اس کا ایک بیٹا ناصرالدین ابراہیم لکھناوتی کا بادشاہ بن بیٹھا - دوسرے بیٹے غیاث الدین بہادر شاہ نے سنار گاؤں پر قبضہ کرلیا - اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر دلی کے بادشاہ غیاث الدین تغلق نے بنگال پر حملہ کردیا اور ۱۳۲۸ء میں آسے دلی کی سلطنت میں شامل کرلیا - انتظامی سہولت کیلئے اس نے بنگال کو تین حصوں میں تقسیم کردیا - شمالی بنگال کا دارالحکومت لکھناوتی ہوا اور خضر خاں عرف ملک پنڈر خلجی کو اس کا گورنر مقرر کیا گیا - مغربی بنگال کا دارالحکومت سپتگرام قرار پایا اور اعظم الملک عرف عزالدین یحییٰ اسکے گورنر -

سنارگاؤں مشرقی بنگال کا دارالحکومت تھا اور بہرام خاں عرف تاتار خاں اسکے گورنر۔

یہ تقسیم جلد ہی ختم ہوگئی۔ اس مرتبہ فرخ دین مبارک شاہ (۱۳۳۸-۴۹) نے مشرق بنگال میں، علاؤالدین علی شاہ (۱۳۴۰-۴۲) نے لکھناوتی، شمالی بنگال میں اور شمس الدین الیاس نے سپتگرام، مغربی بنگال، میں خود مختار ہونے کا اعلان کردیا۔ دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ ہر ایک نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانی چاہی۔ الیاس شاہ نے شمالی بنگال پر چڑھائی کردی۔ اور علی شاہ کو (۱۳۴۲) شکست دیکر اسے بڑی بے عزتی کے ساتھ مارڈالا۔ اس کے بعد اس نے اڑیسہ۔ ترہت اور مشرق بنگال فتح کئے۔ اس طاقتور بادشاہ فخرالدین مبارک شاہ کی وفات پر اس کا بیٹا اختیار الدین غازی شاہ سنارگاؤں میں ۱۳۴۹ء میں تخت نشین ہوا۔ اسوقت تک الیاس شاہ کو مشرقی بنگال پر حملہ کرنیکی جرأت نہ ہوئی تھی۔ ۱۳۵۲ء میں غازی شاہ کا اچانک انتقال ہوا اور کوئی طاقتور بادشاہ سنارگاؤں کی باگ ڈور سنبھالنے کیلئے نہ رہا۔ الیاس شاہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سنارگاؤں پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا اور بڑھکر مشرق اور جنوبی بنگال پر قابض ہوگیا۔

اسطرح الیاس شاہ مغرب میں پورے بہار اور اڑیسہ، شمال میں پورے شمالی بنگال، اور مشرق میں پورے مشرقی بنگال پر قابض ہو بیٹھا۔ مختصر یہ کہ چودھویں صدی میں الیاس شاہ مہا بنگال کا حکمراں ہوگیا ۔ یہ خود مختار بنگال کی مسلمان حکومت کی ابتدا تھی ۔ اسکی ما بعد تاریخ پر آگے بحث کیجائیگی۔ کسی ملک کے سیاسی واقعات کا اسکی ثقافت پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے، لیکن یہ اثر بتدریج ہوتا ہے۔ ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاسی انقلاب کی وجہ سے ثقافت میں بھی دفعتاً انقلاب آجاتا ہے۔

بنگال میں ترکوں کا عہد لڑائیوں سے پر ہے۔ دلی سے فاصلہ کی بنا پر بنگال کے گورنر مرکز سے بغاوت کرنے پر ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بعض اوقات انہوں نے اپنے نام کے سکے چلائے، نئی مسجدیں تعمیر کیں جہاں انکے نام کا خطبہ پڑھا جاتا۔ دلی کے سلطانوں کو بارہا بغاوت فرو کرنی پڑتی تھی ۔ دلی کے شاہی دربار میں بنگال اسقدر بدنام تھا کہ اسکے دارالحکومت کو باغیوں کا اڈا کہا جاتا تھا۔

چنانچہ ترکوں کے عہد حکومت کے ۱۵۰ سال میں بنگال کو امن نصیب نہ ہوا۔ بنگال میں ابھی تک اسلامی معاشرہ اچھی طرح قائم نہ ہونے پایا تھا اور نہ بنگلہ ادب پر اس کا پوری طرح اثر پڑا تھا۔

باب دوم

دور تشکیل

ترکوں کے ڈیڑھ سو سالہ دور حکومت (۱۲۰۱ — ۱۳۵۰) میں جھوٹی موٹی شورشوں کے باوجود ایک اسلامی فضا پیدا ہوگئی۔ ویسے بھی ترکوں سے بہت پہلے صوفیوں اور درویشوں کی تبلیغ اور سوداگروں کی آمد ورفت سے بنگال اسلام سے روشناس ہو چکا تھا۔ ترکوں کے اقتدار سے مسلمان مستحکم ہوگئے۔ بنگالی ادب کی ترقی میں مسلمانوں نے جو حصہ لیا اس کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام اپنے پیرووں کی پوری زندگی پر کس طرح چھا جاتا ہے۔ بنگالی ادب کے لئے مسلمانوں نے جو کام کیا اس کا اندازہ لگانے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ بنگالی ادب کی نشو ونما اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ ترکوں نے صرف جنگیں ہی نہیں لڑیں، ملک ہی فتح نہیں کئے، وہ اپنے ساتھ ایک ترقی یافتہ کلچر اور اسلامی عقائد پر مبنی تہذیب بھی لائے جس نے مسلمانوں

ہی کو نہیں بلکہ غیر مسلموں کو بھی متاثر کیا ۔

اس زمانے کی ایک ادبی تخلیق قابل ذکر ہے۔ یہ ،، شنیا پورن ،، میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے ،، نرنجنیر رشما ،، اور رامائی پنڈت نے لکھی ہے۔ رامائی پنڈت کی ولادت اور اس کی تخلیقات کے صحیح سن و سال کے بارے میں اختلاف رائے ہے مگر اس پر سب متفق ہیں کہ اس کی شروع کی تخلیقات تیرھویں یا چودھویں صدی سے تعلق رکھتی ہیں ۔ داخلی شہادتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ''نرنجنیر رشما،، ترکوں کی فتح بنگالہ کے بعد لکھی گئی ۔ بعد کے نقل نویسوں نے اس کی زبان میں تبدیلیاں کردیں لیکن اب بھی اس میں اسکی مخصوص چاشنی موجود ہے۔ اس میں جے پور اڑیسہ اور مالوہ کے بسنے والے برھمنوں کے ،، شد ھرمی ،، بدھوں پر مظالم کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس میں ایک خیالی تصویر کھینچی گئی ہے کہ کسطرح ھندوؤں کے دیوی دیوتا یکایک مسلمانوں کے پیروں بزرگوں کا روپ دھار لیتے ھیں ۔ یہ تصویر بڑی ناقص ہے اور اس سے ظاھر ھوتا ہے کہ بدھوں یا ھندوؤں کو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں قطعاً معلومات نہیں تھیں ۔ اس سے یہ بھی ثابت ھوتا ھے کہ یہ نظم بنگالی میں اسلام کے ابتدائی دور میں لکھی گئی ۔ ھم

یہاں اس نظم کا مفہوم درج کررہے ہیں کیونکہ اس سے اس ملک کے اسلامی ماحول کی ابتدا کا اندازہ ہوتا ہے :-

" جج پور اڑیسہ میں سولہ سو ویدک برہمن ہیں - وہ نگم کانوں میں ڈال کر گلی گلی بھیک مانگتے ہیں - جو انہیں بھیک نہیں دیتا اسے سراپ دیتے ہیں - اس کا گھر بار بھسم کر ڈالتے ہیں - اپنے پرائے میں فرق نہیں کرتے اور مالدہ کے ہر شخص سے تاوان لیتے ہیں - ان کے کرتوت حد سے گزر گئے ہیں - وہ بڑے طاقتور ہو گئے ہیں - شدھرمی کو یکسر نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں - وید پڑھتے ہیں تو ان کے منہ سے آگ نکلتی ہے ، جس سے دیکھنے والے دھل جاتے ہیں - ہر شخص اس کا مطلب سمجھتا ہے اور خدا سے دعا مانگتا ہے کہ " اے دھرم ہمیں بچالے - ہمیں کوئی اور نہیں بچا سکتا - برہمنوں نے دنیا کو تباہ کرنا شروع کر دیا ہے ، کیسا اندھیر ہے "

برہمنوں کے مظالم سے شدھرمی بودھ خوفزدہ اور پریشان تھے - اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ برہمنوں کے پنجے سے نکل کر اور ترکوں کے ہاتھوں اسلام کی انسانیت نوازی

کے سلوک سے بہت خوش ہوئے ہوں گے اس لئے وہ برھمنوں کی تباھی سے خوش ہوئے اور بنگال میں اسلامی حکومت پر مسرور۔

برھمنوں کی تباھی اور ترکوں کے تسلط کے ساتھ ھی برھمنوں کا اثر زائل ہونا شروع ہوگیا۔ اس خلا کو جس پر برھمن مدتوں سے قابض تھے مسلمانوں نے پورا کیا۔ بختیار اور اس کے امیر مسجدیں بناتے اور مولویوں اور خطیبوں سے جمعہ کے دن اپنے نام کا خطبہ پڑھواتے تھے۔ اس سے اور ان مدرسوں اوو خانقاھوں سے جہاں درویش درس دیتے تھے اسلام پھیلا۔

اسلام کی بنیاد جو بختیار کے عہد میں قائم ھوچکی تھی اس کے بعد بھی رھی۔ اس کا جانشین غیاث الدین پوزہ (۱۲۱۳ ۱۲۲۴ء) اس کی طرح مسجدیں بنواتا اور سیدوں، عالموں اور درویشوں کو وظیفے دیتا اور اس طرح اسلام کی ترقی کیلئے راستے ھموار کرتا گیا۔

۱۲۲۵ ھجری میں مخدوم جلال الدین تبریزی نے بنگال میں تبلیغی کام شروع کیا۔ جب وہ پنڈوا پہنچے توگوڑ کے تخت پر لکشمن سین قابض تھا۔ وہ خود اور اس کا درباری پنڈت

ھلایدھ مسرا ، مخدوم صاحب کی کرامات دیکھ کر حیران ہوئے اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی ۔ انہوں نے پنڈوا میں ایک مسجد بنائی ۔ باغ لگایا، خانقاہ قائم کئے ۔ جس سے ہزاروں غریب الوطن مسافروں، مفلسوں کو لنگر بٹتا تھا ۔ اس زمانے کی لکھی ہوئی ایک نظم ''شیخ شبھودھیا،، میں مخدوم صاحب کی کرامات اور ان کی تبلیغ کا ذکر ملتا ھے ۔ اس نظم سے معلوم ہوتا ھے کہ اس کا کہنے والا پنڈت ھلایدھ تھا ۔ مخدوم جلال الدین تبریزی کا شاہ جلال مجرد یمنی سے ، جنہوں نے ۱۳۰۳ میں بنگال کے فیروز شاہ دھلوی (۱۳۱۱–۱۳۲۲) کے سپہ سالار سکندر غازی کی مدد سے سلہٹ فتح کیا ، کوئی تعلق نہیں ۔ ابن بطوطہ ۱۳۴۵–۴۶ع میں بنگال سے گذرا تو شاہ جلال کی خدمت میں بھی حاضر ہوا ۔ وہ ۱۳۴۷ میں چین پہنچا تو شاہ جلال کی وفات کی خبر اس کو پہنچی ۔ بطوطہ نے لکھا ھے کہ وہ لانبے قد کے دبلے بدن کے آدمی تھے ۔ ایک غار میں پڑے یاد الہیٰ میں غرق رہتے تھے ، دس دن رات روزہ رکھتے تھے اور گیارھویں دن گائے کے دودھ سے افطار کرتے تھے ۔ ایک گائے ان کی کل املاک تھی ۔ ان کی بدولت علاقے کے بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے ۔ سلہٹ میں اب

بھی لوگ شاہ جلال کے گیت گاتے ھیں ۔

شاہ جلال تبریزی (وفات ۱۲۲۵) اور شاہ جلال مجرد یمنی (وفات ۱۳۴۷ء) نے جس کام کو شروع کیا تھا بعد کے صوفیوں اور درویشوں نے اس کو آگے بڑھایا ۔ ان میں سب سے مشہور یہ تھے :۔غازی ملک اکرام خاں جو ۱۲۱۴ میں بنگال آئے اور پار یل میں دفن ھوئے۔انہوں نے ساری عمر ڈھاکے کے مانک گنج کے علاقے میں گزاری ۔ خواجہ معین الدین چشتی کے مرید عبداللہ کرمانی بیر بھوم کے علاقے خستگیری کے رھنے والے (۱۱۴۴-۱۲۳۶ء) مخدوم شاہ محمد غزنوی عرف راھی پیر جو ۱۲۰۲ میں بردوان کے علاقے منگل کوٹ میں آئے ۔ شاہ صفی الدین شہید جو تیرھویں صدی کے آخری زمانے میں فوت ھوئے اور سپتگرام کے علاقے تربینی میں عمر گذار کے چھوٹا پنڈوا میں دفن ھوئے ۔ بدرالدین مبارک علامہ عرف بدر شاہ جو سلطان فخرالدین مبارک شاہ (۱۳۳۹-۱۳۴۹ء) کے زمانے میں ضلع چاٹگام میں رھتے تھے ۔ مخدوم شاہ دولہ جو ۱۲۵۰ عیسوی میں بقیدحیات تھے اور بوگرہ اور پبنا کے رھنے والے تھے جوبیس پرگنہ کے علاقے بلندہ کے سید عباس علی مکی عرف پیر گورا چاند ، جو ۱۳۲۳ عیسوی میں زندہ تھے۔ اور ان سب سے مشہور اور بے

مثال محقق اور مذهبی عالم عطا ، جو ۱۳۰۰ اور ۱۳۵۰ کے درمیان دیناج پور میں تبلیغ اسلام کرتے تھے -

ان بزرگوں کی قوت اور ان کی تبلیغ کے خلوص کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ھے کہ اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے -، مثلا ۱۲۸۸ میں لکھناوتی کے گوڑ کو لے لیجئے جو اس زمانے میں درویشوں کے ھندوستانی فرقہ' قلندریہ کا مرکز تھا - کہا جاتا ھے کہ اس فرقے کے پیشوا نے سلطان غیاث الدین طغرل کو (۱۲۸۱-۱۶۶۸) دھلی سے باغی ھو جانے کا مشورہ دیا - سلطان نے ان درویشوں کو تین من سونا نذر کیا - اس فرقے کے درویش ھاتھوں اور پیروں میں لوھے کے کنگن پہنتے تھے - سونا ملا تو وہ سونے کے کنگن پہننے لگے - طغرل کی شکست کے بعد پیشوا کو موت کی سزا دی گئی ، مگر یہ فرقہ نہ مٹایا جا سکا -

اس واقعے کی اھمیت سمجھنے کے لئے ھمیں ابن بطوطہ کا مطالعہ کرنا چاھئے - اس کا بیان ھے کہ فخر الدین مبارک شاہ کے زمانے میں ان درویشوں کی کرامات شمار سے باھر تھیں - کشتی کا کرایہ ان کو معاف تھا - شہر پہنچتے ھی انہیں نصف دینار کا نذرانہ ملتا تھا - سلطان کو ان درویشوں پر اتنا اعتماد ھو چکا

تھا کہ اس نے ایک درویش، شیدا، کو ست گاؤں (چاٹگام) کا گورنر مقرر کر دیا۔ شیدا باغی ہو گیا اور اس نے سلطان کے فرزند کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سلطان نے چاٹگام جا کر اس کی سرکوبی کرنی چاہی۔ مگر شیدا سنار گاؤں بھاگ گیا۔ پھر وہاں اسے گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔ ابن بطوطہ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ درویش بدرالدین علامہ عرف "بدر پیر" نے سلطان فخرالدین کے ایک جرنیل، بادل خان کو چاٹگام فتح کرنے کے لئے بھیجا۔ بدر پیر کا بنگال پر جو اثر تھا اس کا آپ اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج بھی مشرقی بنگال کے مانجھی جب طوفانی ندیوں میں گھر جاتے ہیں تو پکارتے ہیں:

"اللہ نبی، پنج پیر بدر بدر!"

بنگال کے کونے کونے میں مسلم کلچر پھیل گیا۔ درویشوں کی حیات پاک عوام کے لئے نمونہ بنی، جو پہلے ہندو برہمنوں کے زیر اثر تھے اور جب ہندو راج کے ساتھ برہمنوں کے مظالم ختم ہو گئے تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ عام لوگ مسلمانوں کو جنہوں نے انہیں طویل غلامی سے چھڑایا تھا، اپنا نجات دہندہ تصور کرتے تھے۔

ترکوں کی فتح بنگال کے بعد غیر ملکوں کے مسلمانوں کی

ایک بڑی تعداد بنگال آنے لگی جن میں سے کچھ تو قسمت آزمانے آتے تھے، کچھ تجارت کے سلسلے میں اور کچھ اپنے ملکوں سے بھاگ کر پناہ لینے کے لئے۔ بختیار اور اس کے جرنیلوں کے ساتھ آئے ہوئے سپاہی یا تو غیر شادی شدہ تھے یا بیویاں ساتھ نہ لائے تھے۔ انہوں نے، نیز بہت سے دوسرے مسلمانوں نے، بنگال میں شادیاں کرلیں اور یہیں کے ہو رہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد مسلمان بنگال میں ایک تہذیبی قوت بن گئے۔

باب سوم

ترکوں کے عہد میں بنگالی ادب

ہم دیکھ چکے ھیں کہ اسلامی کلچر سے بنگال میں علمی احیاء کی بنیاد پڑی اور اب بنگال ایک نفسیاتی انقلاب سے دوچار ہونے لگا - بنگال کی دنیا دو حصوں میں منقسم تھی - ایک نئی تنومند اسلامی دنیا تھی اور دوسری قدیم، خستہ حال، شکستہ اور رسوم زدہ ھندو دنیا -

اس عبوری دور میں کسی تخلیقی تحریک کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی- لیکن اس دور میں بھی گیت اور رزمیہ نظمیں ضرور لکھی گئی ہوں گی جن میں سے ایک اب تک باقی ھے - اس کا نام ''نربخنیر رشما،، ھے اور اسے رامائی پنڈت نے تیرھویں صدی میں لکھا تھا -

بارھویں صدی تک بنگلی ادب ابھی ابتدائی دور میں تھا - البتہ ''چریاپدا،، میں کچھ کچھ پختگی پائی جاتی ھے - یہ قیاس کرنا کچھ مشکل نہیں کہ ''اپ بھرنش،، کی مخصوص فضا

اور چریا کے اسلوب جو بعد کی بنگالی زبان کی خصوصیت تھے ، ترکوں ہی کے زمانے میں داخل ہوئے تھے۔''پرا کرت پونجالہ'' زبان میں نظموں کا ایک مجموعہ ہے ، جس میں اس کی مثالیں ملتی ہیں ۔ یہ مجموعہ چودھویں صدی میں مرتب کیا گیا تھا جس میں پرا کرت کی بحروں کی مختلف اقسام اور خصوصیات بتائی گئی ہیں ۔ اسی قسم کے اور مجموعے بھی ترکوں کے ابتدائی دور میں مرتب کئے گئے ہوں گے ، کیونکہ ان نظموں کی زبان ''چریا پدا ،، سے بہت ملتی جلتی ہے۔ یہ نظم '' تری پدی ،، بحر میں لکھی گئی ہے ۔ اس کے فوراً بعد کے بنگالی ادب میں یہ بحر عام طور سے رائج ہو گئی ، بنگالی پر پرا کرت کا ملمع ایسا ہلکا ہے کہ بنگالی کی اپنی خصوصیات واضح رہتی ہیں ۔ اس زبان کو پرا کرت کی بجائے قدیم بنگالی کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا ۔

''شیخ شبھودائے،، میں بھی ، جو سنسکرت کی کتاب ہے ، اسی قسم کا ایک گیت ملتا ہے ۔ جس میں شیخ جلال الدین تبریزی کی کرامات کا ذکر ہے ۔ اس کی زبان اور اس میں آئے ہوئے بعض ناموں کے ذکر سے جو اس زمانے کے درویشوں سے مشابہ ہیں ، بعض محقق یہ نیتجہ نکالتے ہیں کہ یہ نظم

علاوہ دوسرا کی کوئی ثبوت نہیں ہے ۔ لیکن میرے نزدیک اس کا مقطع ، یعنی وہ مصرع جہاں شاعر کا نام آیا ہے ، کافی اہم ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس دور کے بعد کی نہیں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان نقل نویسوں نے اس میں اپنے طور سے کچھ تبدیلیاں کردی ہوں ۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ " شیخ شبھودیا " تیرھویں صدی کے ابتدائی زمانے میں لکھی گئی تھی ۔

اس کتاب کی تخلیق سے چار سو سال قبل بنگالی مسلمان تذکرہ نویسوں سے آشنا ہونے شروع ہوئے تھے ، اس لئے اس کتاب میں ان کی کرامات کا ذکر کچھ عجیب معلوم نہیں ہوتا ۔ یہ سنسکرت میں لکھی گئی ہے تاہم بنگالی ادب میں اس کا بڑا اونچا مقام ہے جس کی وجوہات یہ ہیں :

(الف) اس کی سنسکرت نثر اس زمانے کی بنگالی سے متاثر ہے ۔

(ب) اس میں قدیم بنگالی کی مثالیں ملتی ہیں جن میں پیر کے کمالات کی داستانیں ، عشقیہ گیت اور " خان " کے اقوال خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔

(ج) اس سے ہمیں بالواسطہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا بنگالی ادب میں کہاں کہاں حصہ ہے ۔

پیر کی کرامات کی تین کہانیوں میں سے پہلی ، (چھپی ہوئی کتاب کا صفحہ ۱۲) اور دوسری ، (صفحہ ۹۵) بہت چھوٹی ہیں۔ لیکن تیسری ، (صفحہ ۹۴-۹۳) ، کافی لمبی ہے - سولھویں سترھویں اور اٹھارویں صدی کی جتنی داستانیں ہم تک پہنچی ہیں ، ان میں سے یہ قدیم ترین ہیں - جذبات تصنع سے پاک ہیں اور غیر قدرتی یا خلوص سے عاری محسوس نہیں ہوتے گو ان کا مصنف ہندو ہے - ہندو اول اول مسلمان درویشوں کو دیوتاؤں کے لگ بھگ سمجھتے تھے - لیکن مسلمان انہیں اللہ کے نیک بندے جان کے ان کا احترام کرتے تھے - ہندو زندہ دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے جن کی قوتوں کا مظہر وہ ان پیروں کے افعال و کرامات کو سمجھتے تھے - ان کی مدح سرائی انسانی عظمت کی مدح سرائی نہ تھی -

"شیخ شبھو دائے" میں پیروں کی عظمت کے بیان کی وجوہات وہی ہیں جن کی بناپر بعد میں شری چیتنیا کی زندگی اور عظمت پر کتاب لکھی اور پسند کی گئی -

"خان کے اقوال"، بھی قدیم بنگالی کا ایک نمونہ ہیں- ان کی زبان بعد کے زمانے میں تبدیل کی گئی ہے لیکن ان کی قدیم خصوصیات پر شبہ نہیں کیا جاسکتا - یہ اقوال زراعت ،

روزمرہ کے معاملات، موسم، اور ایسی ہی دوسری باتوں کے بارے
میں سیکڑوں برس کے تجربے کا نچوڑ ہیں۔

"شیخ شبھو دایۓ" کا عشقیہ گیت قدیم بنگالی ادب میں
اس قسم کے گیت کی واحد مثال ہے۔ قدیم بنگالی میں شاید
ہی کوئی گیت کسی ایک فرد پر لکھا گیا ہو۔ بیسویں صدی
میں عوامی ادب کے جتنے مجموعے چھپے ہیں ان میں کوئی چیز
ایسی نہیں جو پندرھویں صدی سے پہلے کی لکھی ہوئی ہو،
اس لحاظ سے یہ گیت بے حد اہم ہے۔ ایک کہانی جو اس
نظم میں بیان کی گئی شاید دلچسپی کا باعث ہو گی:

"میں ایک ودھوا ہوں۔ روز گنگا اشنان کے لئے
جاتی ہوں۔ مجھ سے ایک بھول ہوگئی، لیکن آندھی
سے جھاڑیاں تو نہیں ٹوٹتیں۔ اس بھول کا ذکر چھوڑو،
مجھے گھر جانا ہے۔ سمندر میں لوہے کی ایک کان ہے۔
میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ ہے ایشور! میری عزت کی رکھشا
کرنا! بڑی کٹھنائی ہے۔ مگر اس سے نکلنے کا ایک
راستہ بھی ہے۔ اچھے کپڑے پہننے والوں سے بھیڑیا بھی
ڈرتا ہے۔ میں تیرے چرن پڑتی ہوں۔ سورنشوری گنگا
ہمارے درمیان بہ رہی ہے میں اپنے تن پر سری کھنڈ کا

چندن ملتی ہوں تو ٹھنڈک پہنچتی ہے، لیکن رات کو تو آگ ہی لگ جاتی ہے۔ میرا سینہ جوش کے مارے ابھر آتا ہے۔ گرمی بڑھتی جاتی ہے۔ جوانی کا بوجھ اٹھائے جیون بتا رہی ہوں —— لیکن موت نہیں آتی۔ آنسو ڈالوں سے ڈھل رہے ہیں۔ آتما تن میں بے کل ہے لیکن من سے دور نہیں جاسکتا۔ آہیں چاروں اور گونج کر میری ہنسی اڑاتی ہیں۔ ناریل آندھی بنا ہی ٹوٹ پڑے۔ ناریل کا پیڑ دھرتی پر آن گرا۔ میرے مکھ پر جھریاں پڑ گئیں۔ بالم جاؤ اب کاہے کا ڈر۔"

حصہ سوم

آزاد مسلم بنگال

(۱۳۵۰ء سے ۱۵۷۶ء تک)

باب اول

سیاسی پس منظر

گوڑ میں سلطان شمس الدین الیاس شاہ کے عروج ۱۳۴۲–۱۳۵۷ کے ساتھ بنگال میں ترکوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ الیاس شاہ صاحب نظر آدمی تھا۔ بنگالی زبان اور ادب کی سرپرستی کرکے اس نے بنگال میں مسلم کلچر کے احیاء کا ایک نیا دور شروع کیا۔ ۱۳۵۰ سے داؤد خاں کے زوال تک، جو ۱۵۷۶ میں واقع ہوا، گوڑ کا دربار بنگال کا تہذیبی مرکز رہا۔

مسلمان بادشاہوں کی مسلسل حکومت سے ادب اور آرٹ کی ترقی کیلئے موزوں فضا پیدا ہوگئی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی حکومت مقامی باشندوں کیلئے اتنی رواداراناہ، فراخدل اور آزاد خیال تھی کہ مقامی ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اسلام کی

تہذیبی قوت سے متاثر ہوکر اپنے آپ مسلمان ہوگئی اور اپنے ساتھ طرح طرح کے مقامی رسم و رواج بھی لے آئی ۔ گوڑ کی کئی مسجدیں اب بھی اس امر کی گواہی دیتی ہیں ۔ سلطان یوسف شاہ کی ۱۴۷۵ء میں بنائی ہوئی ''لوٹن'' مسجد درباری رقاصہ ''میرا بائی'' کی یاد دہ ہے ۔ بنگلی بول چال میں ''نرتن'' یعنی ناچ کی جگہ ''لوٹن'' استعمال ہوتا ہے ۔ تناسب اور حسن و آرائش میں یہ مسجد گوڑ بھر میں بے مثال ہے ۔ اسی طرح ''راج بی بی'' کی مسجد ہے جو کوتوالی دروازے کے جنوب مشرق میں باگوا اور کنیائنا کی جھیلوں کے درمیان واقع ہے ۔ اس کوتوالی کے دروازے کے قریب 'پیٹھا' والی مسجد ہے جو گوڑ کے شاہی حرم میں مٹھائی بانٹنے کی رسم کا نقشہ پتھر پر پیش کرتی ہے ۔ یہاں کے رہنے والے ھندوؤں کا اسلام قبول کرنا اتنی اھمیت کی بات نہیں جتنی اھمیت کی بات یہ ہے کہ بنگلی زبان دربار کی حدود میں داخل ہو کے اچھی طرح نکھر کر چکی تھی جہاں اسے ترقی کے مواقع اور سرپرستی حاصل ہوئی ۔

سلطان غیاث الدین اعظم شاہ کے زمانے میں بنگلی ادب کی ترقی کیلئے ایک اور اہم قدم اٹھایا گیا ۔ اس نے نہ صرف ''حافظ شیرازی'' کو بلاوا بھیجا بلکہ مانتھیلی شاعر، ودیا پتی اور بنگلی

کے پہلے مسلمان شاعر "محمد صغیر" کی بھی سرپرستی کی - ودیاپتی نے بعد میں ایک نظم میں سلطان غیاث الدین اعظم شاہ کی مدح کی اور اسے "پر بھو کیاس دیو سرتان" کہا ہے - وہ لکھتا ہے :

شہنشاہوں میں سب سے زیادہ عالم اور مذہبی
جسے دنیا میں دیوتاؤں کا اوتار مانا جاتا ہے
جو عوام کے لئے مجسم انصاف ہے
سلطان عظیم غیاث عالم پناہ ہے
میں ساری عمر یہ محسوس کرتا رہا ہوں
کہ اس کی عزت کرنے سے بڑی کوئی نیکی نہیں

سلطان غیاث الدین ایک عظیم حکمراں تھا لیکن تاریخ اسے کلچر کے سر پرست کی عظیم تر حیثیت سے یاد کرے گی - فارسی ، مائیتھلی اور بنگلہ ادب کو ترقی دینے کے وہ لافانی ہوگیا ہے -

بنگال پر مسلمانوں کے تسلط کے بعد بھی ہندو جاگیرداری کچھ مدت قائم رہی - یہ جاگیر دار زیادہ تر ہندو تھے جن میں شمالی بنگال کا راجہ گنیش زیادہ مشہور ہے - راجہ گنیش نے ۱۴۱۰ء میں گوڑ کے تخت پر قبضہ کر لیا ، لیکن پنڈوا کے مشہور درویش شیخ نورالدین قطب عالم ،

جو مسلمانوں کے با اثر رہنما تھے کی تبلیغ سے راجہ گنیش کا فرزند ''جادو'' مسلمان ہو گیا ۔ ''جادو'' نے سلطان جلال الدین محمد شاہ کے نام سے بنگال پر ۱۴ برس حکومت کی ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شمس الدین تخت نشین ہوا جس نے ۱۴۳۱ سے ۱۴۴۲ تک، گیارہ برس حکومت کی ۔

گویا مسلمانوں کی فتح بنگال کے ایک صدی کے اندر اندر عنان حکومت ایک مقامی مسلمان کے ہاتھ میں چلی گئی ۔ اس صدی کے آخری ۲۸ سال بنگلی ادب کے لئے خاص طور سے اہم ہیں کیونکہ اس زمانے میں سیاسی، تہذیبی، ادبی میدانوں میں انقلاب آیا ۔ دربار میں بنگلی زبان اور ادب جگہ پا چکے تھے ، لیکن اب ان کو شاہ کی ذاتی سرپرستی اور قبول عام نصیب ہوا ۔ بنگالی ''راماین'' کا مصنف 'کرتی واش،' پہلا بنگالی ادیب تھا جس نے سلطان جلال الدین کے دربار میں اپنے اشعار پڑھے ۔ ان کو سن کر سلطان نے پھولوں کی مالا اس کے گلے میں ڈال کر عزت بخشی ۔ ''کرتی'' نے اپنے ان اشعار میں بادشاہ کا نام نہیں لیا، مگر جدید تحقیق سے ثابت ہوچکا ہے کہ اس کی مراد جلال الدین ہی سے ہے ۔

بنگلی ادب کے قبول عام پانے سے بڑے دور رس نتائج نکلے ۔

اس خاندان کا تیسرا بادشاہ شمس الدین احمد تھا (۱۴۳۱—۱۴۴۲) - معلوم نہیں اس نے اپنے عہد کے کسی شاعر کو سرفراز کیا یا نہیں، مگر یہ مسلمہ امر ہے کہ اس کے عہد میں چنڈی داس پیدا ہوا - چنڈی داس کے صوفی ہمعصر ''رمی،، کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ چنڈی داس گوڑ کے دربار میں بھی پہنچا جہاں اس نے اپنا کلام سنایا۔ اس بات کے شواہد بھی موجود ہیں کہ چھوٹے، بڑے، امیر اور راجگان وغیرہ اس دور میں گوڑ کا تتبع کیا کرتے تھے -

۱۴۴۲ میں الیاس شاہ کا خاندان پھر گوڑ پر قابض ہو گیا اور اس خاندان کے چار بادشاہوں نے ۵۴ سال حکومت کی - اس زمانے میں بنگلی کو دربار میں مستقل حیثیت حاصل رہی - مالا دھر باسو، زین الدین اور دھروانند مسرا اس بات کی مثال ہیں -

مالادھر باسو نے سات سال (۱۴۷۳—۱۴۸۰) میں ,,سری کرشن وجے،، لکھی - سلطان اسے دیکھ کے اتنا خوش ہوا کہ اس نے اسے ,,گن راج خان،، کا خطاب بخشا - سلطان شمس الدین یوسف شاہ، (۱۴۸۱—۱۴۷۴)، بنگالی کی سرپرستی کے لئے مشہور ہے - اس نے زین الدین کی حوصلہ افزائی کی

کہ وہ رسول کریم کی شان میں ایک مثنوی لکھے۔ اس مثنوی کانام ''رسول وجے'' ہے۔

اس خاندان کے آخری حکمراں، سلطان جلال الدین فتح شاہ کے عہد میں ۱۴۸۵ میں دھروانند مسرا نے اپنی مشہور سماجی تاریخ ''مہاونشاولی'' لکھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادبی کام اس زمانے کی تہذیب کا ایک جزوبن چکا تھا۔

الیاس شاہ کے خاندان کا دور ختم ہونے کے بعد سات سال تک ادبی کام کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ پھر ۱۴۹۳ء میں حسین شاہ گوڑ کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد ۱۴۹۳ سے ۱۵۳۸ تک ۴۵ سال بنگالی زبان اور ادب خوب پھلے پھولے۔

حسین شاہ اور اس کے خاندان کی ادب نوازی اور سر پرستی نے ادب کی ترقی کی نئی راہیں دکھائیں۔

حسین شاہ علوم و ثقافت اسلامی سے کئی طور پر بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع النظر اور عالی خیال حکمراں بھی تھا، وہ نسلاً عرب تھا مگر اس نے ایک بنگالی خاندان میں شادی کی تھی، جس سے اس کا رشتہ بنگالیوں سے بہت گہرا ہو گیا تھا۔ اس سے بنگال کو بہت فائدہ ہوا۔ نوی وجے گپتا نے، جو مؤرخ

فلاشری (باریسال) کا رہنے والا تھا، اپنی کتاب ''منسا منگل'' کے دیباچے میں (جوسن ۱۴۱۶ شا کا یا ۱۴۹۴ء کی تصنیف ہے)، حسین شاہ کی تعریف میں زورِ قلم صرف کیا ہے - چوبیس پرگنہ کے بشیر ہاٹ سب ڈویژن کے گاؤں ویدیا کے ایک شاعر نے بھی حسین شاہ کی بہت تعریف کی ہے -

''برج بولی'' میں شعر کہنے کا رواج بھی اسی زمانے میں شروع ہوا - ''شری کھنڈ'' کا شاعر جسراج خان حسین شاہ کا ملازم تھا - اس نے جہاں کہیں سلطان کی تعریف کی ہے اس میں اپنی وفاداری سے کہیں زیادہ شاہ کی بنگالی ادب سے شیفتگی پر زور دیا ہے - اگر اس نے اپنے ممدوح کو ''زیور دنیا،، کے لقب سے یاد کیا ہے تو اسے قصیدہ گوئی کہا جاسکتا ہے لیکن جب وہ اس کے منجھے ہوئے ادبی مذاق کا ذکر کرتا ہے تو کوئی مبالغہ نہیں کرتا -

حسین شاہ کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہندوؤں کے مذہبی صحیفوں کا بنگلی میں ترجمہ کروانا ہے - اس کے جرنیل 'پراگل خان'، کی ہدایت پر، جس نے کٹک اور تریپورہ فتح کیا 'کوندر پرمیشور' نے ''مہابھارت'' پنچالی میں لکھی جو 'پراگلی مہابھارت' کے نام سے زیادہ مشہور ہے - حسین شاہ کے

بارے میں وہ لکھتا ہے :-

ایشور کے اوتار کی طرح اس کلجگ میں
دنیا بھر میں نامور
سلطان علاؤالدین شاہ گوڑ جس کی شہرت
ترلوک کی حدیں پھاند چکی ہے -

"ودیا سندر" کی منظوم داستان بھی حسین شاہ ھی کے دور میں لکھی گئی - ضلع میمن سنگھ کے ایک برھمن کو جس کا نام "کاکا" تھا اس کے ھم مذھبوں نے اپنے مت سے خارج کردیا - اس نے ایک مسلمان پیر سے بیعت کرلی - "ودیا سندر،، اس نے اپنے پیر کی ھدایت پر ۱۵۰۲ء میں لکھی جو "ست پیر،، کی روحانی عظمت کا بیان ہے۔

'منسا منگل' کی عوامی داستان بنگالی ادب کی نئی ھیئت "برج بولی،، کا رواج، ھندوؤں کی مذھبی کتابوں کا بنگالی ترجمہ، بنگالی مہابھارت اور دیو مالا کی مشہور کہانی "ودیا سندر" یہ سب کارنامے، جنھوں نے بنگالی ادب کو مالا مال کیا، حسین شاہ ھی کے عہد کی یادگار ھیں -

اس عہد کا ایک اور قابل ذکر واقعہ چیتنیا کا ظہور ہے،

(۱۵۳۳-۱۴۸۶ء) جو وشنومت کا پرچارک تھا۔ اس نے وشنومت پر بہت کچھ لکھا جو بعد میں بنگالی ادب کا بہت قیمتی سرمایہ قرار دیا گیا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے نصیر الدین شاہ (۱۵۱۹-۱۵۳۱ء) نے بنگالی ادب کی سرپرستی جاری رکھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بھی " مہابھارت " کا بنگالی میں ترجمہ کرایا۔ ودیا پتی کوی رنجن شری کھنڈ شاعر نے اپنے " ورج بولی " کے کلام میں سلطان کا بہت احترام سے ذکر کیا ہے :۔

"اور بورے سوچ بچار کے بعد کوی ودیا پتی کہتا ہے :

سلطان ناصر شاہ شہد کی مکھی کے سمان خوش ہے جو

کنول کے نام اپنا پیٹ کا سندیسہ بھول چکا ہو۔"

ایک مسلمان شاعر شیخ کبیر نے بھی اپنے " ورج بولی " کلام میں ایسے ہی احترام سے اس کا ذکر کیا ہے :

" عاجز شیخ کبیر اس کی (بادشاہ) کی عظمت کو جانتے ہوئے کہتا ہے کہ سلطان نصیر شاہ کنولوں کے جھرمٹ میں گم ہو گیا "۔

ادب کی محبت اس خاندان کے بادشاہوں کا ورثہ ھے - نصرت شاہ کا بیٹا علاؤالدین فیروز شاہ چند ھی مہینے حکمراں رھا ، لیکن اس نے بھی کوی شری دھار کو "ودیا سندر" لکھنے پر مامور کیا - شری دھار لکھتا ھے :

نصیر شاہ کا سندر پوت
سب گنوں کا ماھر ھے کنولوں میں همهماتی ھوئی شہد کی مکھی کی طرح سری فیروز شاہ ولیعہد کو کون نہیں جانتا - کوی راج شری دھر پنچالی انچھروں میں اسکی بڑائی کرتا ھے،،

فیروز شاہ کے چچا غیاث الدین محمود نے ۱۵۳۳ء سے ۱۵۳۸ تک پانچ سال حکومت کی - برندا بنی داس (۱۵۰۶ — ۱۵۸۹ء) کی "چیتنیا بھگوت ،، اور لوکن داس کی "چیتنیا منگل،، اسی زمانے میں لکھی گئی اور "بنسی بدن ،، بھی اسی دور میں مشہور ھوئی -

بنگالی ادب کی بنیاد مضبوط ھوچکی تھی اور عہد افغانی کے آئندہ پچیس سال میں اسے مزید ترقی ھوتی چلی گئی - مکند رام سین، رام چندر خان، جےنند، رگھو ناتھ پنڈت، مادھو آچاریہ ، بنسی داس چند راوتی، گنین داس اور گووند داس جیسے با کمال

شعرا اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

اس زمانے میں بنگالی رسم الخط مروج تھا۔ شیر شاہ کی ایک توپ پر اس کا نام اسی رسم الخط میں کندہ ہے۔ عیسیٰ خان کی ایک توپ پر (۱۵۷۵ء) "شری عیسیٰ خان" لکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شاہوں اور حاکموں نے اس رسم الخط کو قبول کر لیا تھا۔ راجشاہی کے ورندر عجائب گھر، میں ۱۵۳۳ء کے زمانے کا ایک پتھر ہے جس پر بنگالی رسم الخط میں سنسکرت لکھی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگالی اتنا رواج پا چکی تھی کہ سنسکرت بھی اسی میں لکھی جاتی تھی۔ یہ کتبہ سولہویں صدی کے ابتدائی بنگالی رسم الخط کا نمونہ ہے۔ نور باز خاں کے بیٹے فارس خاں وزیر اعظم نے ایک پل بنوایا تھا جس کی یادگار یہ کتبہ ہے۔

یہاں یہ ذکر کردینا مناسب ہوگا کہ انیسویں صدی کے شروع میں بنگالی ادیبوں کے ایک گروہ نے مذہبی کتابیں عربی رسم الخط اور بنگالی زبان میں لکھنی شروع کیں۔ اس دور کے ایک بنگالی شاعر محمد جان نے مشہور کتاب "نماز مہاتما" ۱۸۵۲ء میں لکھی۔ اس کے جو مسودے اب تک مل چکے ہیں، جن میں چار بنگالی رسم الخط میں ہیں اور دو عربی میں۔ ۱۸۵۲ء سے پہلے کی عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی کوئی بنگالی کتاب موجود نہیں۔ لیکن علاول کی "پدماوتی" جو ڈیڑھ سو سال پہلے کی ہے، اور عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی بنگالی کتاب ہے۔

باب دوم

تہذیبی پس منظر

ہم مسلم بنگال کے تہذیبی پس منظر کا ذکر کر چکے ہیں اور یہ جان چکے ہیں کہ اس عہد کا ایک کارنامہ بنگالی زبان اور ادب کی ترقی تھا ۔ اس زمانے میں مختلف ضروریات کے لئے لوگ بنگالی لکھتے پڑھتے تھے ۔ لیکن مسلمانوں کے آنے کے بعد بھی ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت تھی جس کی عوام کے دل میں بڑی توقیر تھی ۔ مسلمانوں کے زمانے میں سنسکرت کی درباری زبان کی حیثیت جاتی رہی ، لیکن بہت سے مسلمان عالموں نے اس زبان کو ہندو کلچر کو سمجھنے کی غرض سے پڑھا ۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ مسلمانوں نے سنسکرت کو نفرت کی نظر سے دیکھا ہو اور یہ قدرتی امر ہے ، کیونکہ جب ایک قوم عظمت کو پہنچ جاتی ہے تو کوشش کرتی ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں میں جو علم بھرا پڑا ہے ، جہاں تک ممکن ہو ، اسے حاصل کرنے ۔

بنگالی مسلمان ایک ترقی پذیر قوم ہونے کی حیثیت سے اس اصول سے مستثنیٰ نہ تھے لیکن ان کے فکر و خیال کا منبع روادارانہ اسلامی عقائد و ثقافت ہی تھے۔

اس بات کے کافی شواہد موجود ہیں کہ مسلمان اس زمانے میں اور ترکوں کے زمانے میں عربی اور فارسی پڑھا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی ابتدا سے ہماری آزادی کی منزل تک کے تمام سنگی کتبے سب عربی میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمان اس زبان سے متعلق ہونا فرض منصبی سمجھتے تھے کیونکہ یہ ان کی توانا تہذیبی روایتوں کی حامل تھی۔ وہ ہر مسلمان مرد عورت کے لئے لکھنا پڑھنا ایک ضروری فریضہ سمجھتے تھے۔ بنگالی کی نشو ونما پر عربی کے جو اثرات پڑے وہ ظاہر ہیں۔ فارسی درباری زبان تھی۔ اس کے واسطے سے عربی کے الفاظ کافی حد تک بنگالی میں داخل ہوئے۔ مگر بلا واسطہ طور پر بھی بنگالی نے عربی الفاظ کا ایک قابل ذکر ذخیرہ قبول کیا۔ ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ مسلمانوں نے بنگالی میں مذہبی کتابیں تصنیف کیں جو عربی زبان اور ادب کے براہ راست مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ مسلمانوں کے دور اقتدار میں فارسی مستقل طور پر سرکاری زبان رہی۔

ہندو اور مسلمان دونوں یہ زبان پڑھا کرتے تھے - بعض تو محض اس وجہ سے کہ یہ درباری زبان تھی، لیکن بہت سے اس لئے کہ مسلمانوں کے کلچر کو سمجھ سکیں - جے نند کی "چیتنیا منگل" سے ہمیں ملک کے ہندوؤں پر مسلمانوں کے رہن سہن اور فارسی ادب کے بتدریج اثرات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے - جے نند جگائی اور مدھائی کا، جو بعد میں شری چیتنیا کے چیلے ہو گئے، ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے اور ہندوؤں کے آداب کا بھی نقشہ کھینچتا ہے کہ :- "برہمن ڈاڑھی رکھتا ہے - فارسی پڑھتا ہے - موزے پہنتا ہے - ایک ہاتھ میں لکڑی، دوسرے میں کمان رکھتا ہے اور مثنوی بھی سناتا ہے" - قدرتی طور پر ہندو بھی فارسی ادب اور زبان سے اثر پذیر تھے - یہ اثرات زیادہ تر نفس مضمون، تخیل اور اس ملک کی زبان اور تراجم میں نمایاں ہیں -

ہمارے کلچر میں زبان کے بعد اسلامی کردار کو اہمیت حاصل ہے - مسلمانوں کے دور فرمانروائی کے ساتھ اسلام ملک میں مستقل طور پر قائم ہو گیا - بنگال کی آزادی سے پہلے اسلام اس ملک میں دور تک نہیں پھیلا تھا - اسلامی فتوحات کے ساتھ اسلام بھی خوب پھلا پھولا - مسلمان جرنیلوں نے نئے نئے

علاقے سارے اور صوفیوں اور درویشوں نے زور شور سے تبلیغ جاری رکھی۔ اس سلسلہ میں خاص طور سے مشہور بزرگوں کے نام یہ ہیں: اخی سراج الدین، گوڑ۔ (وفات ۱۳۵۷) شیخ علاؤالحق، پنڈوا (وفات ۱۳۹۸)۔ نور قطب عالم۔ (وفات ۱۴۱۶) شاہ انور قلی حلوائی، فرفرہ۔ ہگلی (وفات ۱۳۷۵)۔ شاہ اسماعیل غازی، رنگپور (۱۴۷۴ میں قتل کئے گئے) خان جہان، کھلنا (وفات ۱۴۵۸)، حاجی بابا صالح، سنار گاؤں (وفات ۱۵۰۶) شاہ جلال۔ سلہٹ (وفات ۱۳۴۶)۔ شاہ محسن اولیا، چاٹگام (وفات ۱۳۹۷)۔ پیر بدر۔ (زمانہ فخرالدین مبارک شاہ)، راستی شاہ، نمرہ (۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸) مولانا برخوردار، گوڑ (۱۳۸۶ تک بھی)، مولانا عطا، دیوا کوٹ (وفات ۱۳۵۵)، مولانا شاہ دولہ راج شاہی (۱۵۱۹ میں زندہ تھے)، شاہ چاند عرف دادا پیر، مرشد آباد (۱۴۹۳ تا ۱۵۱۹) سید جلال الدین عادلی سبتگرام (وفات ۱۵۳۱) اور سید شاہ علی بغدادی میرپور، ڈھاکہ (۱۵۲۰ میں زندہ تھے)۔ ملک میں صوفیا کی ایک بڑی تعداد تبلیغ کا کام کرتی تھی۔ لیکن ان کے ساتھ ہی اس ملک کے شاہوں اور حاکموں کو بھی یاد رکھنا چاہئے۔ ان کے ہزاروں کتبے اب بھی ملک بھر میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کتبوں سے اگر ان بادشاہوں کا تصور کیجئے تو وہ خونریز بادشاہ نہیں دکھائی دیتے بلکہ اسلام کے اثر سے امن پسند، منصف اور روادار انسان معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے محبت، رافت اور فراخدلی

ان کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھردی ہے۔ اور مذہبی تعصب کے کچلے ہوئے دکھی عوام بے فکری سے ان برکتوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اسلام کا یہ پہلو عوام کی تبدیلئ مذہب کی اہم ترین وجہ تھی۔ اس کے نتیجے میں لوگ جوق در جوق مسلمان ہوئے۔ ان کے لئے اسلامی کلچر نے نئے بنگالی ادب کی تخلیق کی۔ اسکے بعد انہوں نے نہایت ذوق و شوق سے مسلم بنگالی ادب کو بڑھایا اور پھیلایا۔

اس شیفتگی کی سب سے پہلی مثال ہمیں شاہ محمد صغیر میں ملتی ہے۔وہ غیاث‌الدین اعظم شاہ (۱۳۸۹ تا ۱۴۰۹) کے ملازم تھے جو ان پر بہت مہربان تھا۔ ورنہ وہ کبھی نہ لکھتے کہ : ''شاہ سے بہتر مجھے کوئی پناہ حاصل نہیں''۔

انسانی ذہن کی ترقی اور تہذیب کے فروغ کے لئے آزادی سے بڑا کوئی محرک نہیں۔ اور دو سو سال سے زیادہ کی آزادی نے ہر قسم کی تہذیبی ترقی کیلئے فضا ہموار کردی تھی۔ ملک بھر میں مسجدیں، مدرسے اور دوسرے اداروں کا جال بچھ گیا اور فنون لطیفہ نے ترقی کرنی شروع کردی۔ فنون لطیفہ کے تمام نمونوں میں ہم مقامی اور اسلامی کیفیتوں کی آمیزش محسوس کرتے ہیں۔ زیادہ لائق غور یہ بات ہے کہ

هندوؤں نے مذہبی تصورات پر کس قدر اسلامی رنگ چڑھ گیا تھا۔ چنانچہ بنگال کے کنول کے پھولوں کے ساتھ ہمیں مسلمانوں کے مقدس نمونے اور پھول پتے بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن کنول کے پھولوں پر "اللہ" کا لفظ کندہ کر کے انہیں "مشرف بہ اسلام" کرلیا گیا۔ مشرقی بنگال میں گوڑ کی "چھوٹا سونا مسجد" اس کی خاص مثال ہے۔ اب بھی بنگالی مسلمانوں کی مقبول عام علامت کنول کا پھول ہے جس کی پنکھڑیوں پر "اللہ" کا لفظ کندہ ہوتا ہے۔ اسلام اور بنگال میں جو گہرا اور ابدی رابطہ پیدا ہوا اس کا اظہار بڑی کامیابی کے ساتھ ملک کے ادب میں کیا گیا۔ بنگالی اور ایرانی کلچر کی آمیزش سے ایک نیا اسلامی کلچر پیدا ہوا۔ قدرتی طور پر اس ترکیب عناصر کے نقوش مسلمانوں کے تخلیق کردہ ادب پر زیادہ نمایاں ہیں۔ اس آمیزش کی حدود اور گہرائی کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔

حرم کی ہندو بیگمات کے ساتھ بنگالی زبان شاہی محلوں میں پہنچ گئی۔ شاہی خواتین کو بنگالی سے آشنا کرنے میں بنگالی بولنے والی باندیوں اور دایاؤں نے بھی خاصا کام کیا۔ گوڑ کے دربار میں بنگالی بولنے والے ہندوؤں، مسلمانوں کو بڑے

بڑے عہدے ملے جس سے اس زبان کی تکریم میں اضافہ ہوا۔ آگے چل کر مقامی مسلمان بادشاہوں نے بنگالی کی سرپرستی کی جس سے دربار میں اس کو قبول عام حاصل ہوا۔ حسینی خاندان کے بادشاہوں کی بنگالی زبان ادب اور فنون لطیفہ کی پرورش سے ملک کے چپے چپے میں اس کا چرچا ہوگیا۔ لیکن اس سرپرستی کو مسلمانوں کی طرف سے بنگال کے ادب کو غیر شعوری عطیہ نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ یہ مسلمانوں کا شعوری حصہ ہے۔ اس سرپرستی کے بغیر بنگالی ادب کبھی ترقی نہ کرسکتا اور بن کے پھولوں کی طرح ان دیکھا، ان سنا اپنی موت آپ مرجاتا۔

اس زمانے میں مقامی مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور غیر ملکی مسلمان بھی کچھ پشتوں کے بعد تہذیبی طور پر بنگالی ہوگئے۔ انہوں نے مقامی مسلمان گھرانوں سے ازدواجی رشتے جوڑے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی بنگالیوں میں بھی شمس خان، شیخ اور سید ملتے ہیں۔ مقامی لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی بنگالی رہن سہن ترک نہ کیا۔ چنانچہ اس زمانے کے بعد بنگالی ادب میں مسلمانوں کا حصہ خاص طور سے نمایاں ہے۔ ان کا پیدا کیا ہوا ادب ایسا ہی ہے

جس طرح کنول کے پھول پر "اللہ" کا نام ۔ بنگالی ادب بہ ہر صورت بنگالی رہا لیکن اس میں اسلام کی روح دوڑ گئی ۔ اس دور کے مسلمانوں کا سب سے اہم کام یہی سمجھا جاتا ہے ۔

بنگال کی آزادی کا زمانہ سماجی اور مذہبی ترقی اور آزادی کا زمانہ ہے ۔ اسلام کی جڑیں بہت مضبوطی کے ساتھ ملک میں پیوست ہو گئیں ۔ لاکھوں آدمی اس کو سمجھنے، ماننے اور اس پر عمل کرنے لگے ۔ اس قبول عام سے غیر مسلموں کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو گئے ۔ ذات پات کا شکار ہندو مت اپنی تنگ نظری اور فرقہ بندی سے اسلام کا راستہ نہ روک سکا ۔ ہندو قدرتی طور پر پریشان تھے ۔ راڑھ کے برہمن جاتیوں نے راجا دتا خان کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اس پریشانی کی قدیم ترین مثال ہے جو ہندوؤں کو لاحق تھی ۔ راجہ دتاخان سلطان نصیرالدین محمود شاہ کے عہد میں ایک مذہبی اور سماجی ادارے کا سربراہ تھا ۔ غالباً یہ ۱۴۵۰ کی بات ہے ۔ اس ادارے کا نام "جاتی مالا کچھاری" تھا ۔ راجہ دتاخان نے برہمنوں کے ۵۷ فرقوں کو متحد کرنے کے لئے بڑی

تگ ودو کی - مگر برھمنوں کی بے اطمینانی دور نہ ھوسکی - چند سالوں کے بعد او دے آچار یہ بھادوری نے شمالی بنگال کے برھمنوں میں " پاٹی " اور " کاپ " کو ملا کر " پری ورتن مرجادہ " یعنی تنظیم کی اصلاح شدہ صورت پیش کی - اس سے بھی بات نہ بن سکی - اس کے بعد ۱۴۸۰ میں دیوی وار گھاٹک نے راڑہ برھمنوں کو ۳۶ " میلوں " میں تقسیم کیا - لیکن دھروانند مسرا نے ۱۴۸۵ میں " مہا ونشاولی " لکھی جس سے ظاھر ھوتا ھے کہ برھمن اب بھی ناخوش تھے -

آھستہ آھستہ یہ جذباتی بے اطمینانی اونچی جاتی کے ھندوؤں سے نیچی جاتیوں میں پھیل گئی- ھندوؤں کو ویدوں، دیوتاوں اور پرانوں پر شبہات پیدا ھونے لگے اور انہوں نے نہایت سنجیدگی سے اسلام کے اصولوں پر غور کرنا شروع کردیا - کیا مذھب انسان کے لئے ھے یا انسان مذھب کے لئے ؟ ان کے دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ھونے لگے - اس عہد کے سب سے مشہور شاعر، چنڈی داس نے لکھا ھے :

"سن اے منش میرے بھائی

منش سچا ہے اس سے بڑھ کر کوئی سچائی نہیں اس
سے بہتر کچھ نہیں۔"

قدامت پرستوں کو اس سے بڑی تشویش ہوئی۔
حسین شاہ کے عہد میں پنڈت رگھو نندن اور رگھو ناتھہ
شرومنی نے "نوا دیپ" میں قدامت پرست ہندوؤں کے مرکز
کی پیشوائی سنبھالی اور اپنے طریقوں پر دلائل اور جماعتی
نظام کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش رائیگاں
گئی۔ ۱۵۴۰ کے قریب نولو پنچانن نے "گوشٹی کتھا"
لکھی جس میں اس نے میلہ بندھن کی تلقین کی۔ اس نے رگھو
ناتھ اور رگھو نندن جیسے پنڈتوں کے کام کو نہ سراہا
بلکہ یہ کہا کہ بڑے گھرانے بھی سخت پریشان ہیں۔
لیکن جہاں رگھو نندن اور رگھوناتھ جیسے پنڈت ناکام
ہوچکے تھے اس کی دال کیا گلتی۔ واقعہ یہ ہے کہ
ہندو مذہب اور کلچر کا ایک پہلو بھی ایسا نہیں تھا
جس کو اسلام نے متاثر نہ کیا ہو۔ ہندو اس سے پریشان،
ناراض اور مشتعل تھے۔ ان کے غصے کی ایک مثال پریم
داس کا یہ شعر ملاحظ ہو:

"اس دور کے سب لوگ بد تماشی پر اتر آئے ہیں،

کیونکہ غیر ملکیوں نے ملک پر قبضہ کرلیا ہے"

چیتنا دیو (۱۴۸۵ تا ۱۵۳۳) اس عہد میں پیدا ہوا۔ ۱۵۰۶ کے بعد اس نے کنڈا کے وشنومت کا پرچار شروع کردیا جو گھاٹکوں اور برہمن پنڈتوں کی قدامت پرستی کا رد عمل ہے۔ اس کے پھیلنے کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ اس میں اسلام کے انسانیت نواز اصولوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس مت کا سب سے بڑا اصول "بھگوان کی پرارتھنا اور جانداروں پر رحم" کرنا ہے۔ بھگوان کی پرارتھنا نے سنکیرتن کی شکل اختیار کرلی۔ اور جانداروں پر رحم نے اخوت اور مساوات کا جذبہ پیدا کیا' اور قدیم ذات پات کو تقریباً تباہ کر دیا۔ وشنومت تصوف کے اصول "ذکر" کی بنگالی شکل ہے جو یاد الہیٰ اور خدمت خلق کی بنیادوں پر قائم ہے۔ وشنو مت میں اسلام کی مساوات اور اخوت کے اصول نمایاں ہیں۔ صوفیوں کے سماع اور وشنووں کے کیرتن میں کوئی بھی فرق نہیں۔ سماع اور کیرتن کے بعد وشنووں کی جسمانی اور قلبی کیفیتیں بھی آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ بلکہ بنگالی اور فارسی کی تلمیحات بھی ایک سی ہیں۔ "وشنومت" کا "دھرم"

فارسی کا ''عشق،، ہے رادھا کرشن کے مقابلے میں ''ساقی،، اور ''مے'' یا ''شمع'' ''پروانہ،، ہے - ''ایشریہ،، صوفیوں کی ''کرامت'' کو سمجھیئے -

جیتنیا کا وجود نہ صرف ملک میں ایک سماجی اور مذہبی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا بلکہ بنگال کے ادب کے لئے بھی انقلاب آفریں ثابت ہوا - رگھو نندن اور رگھو ناتھ کے علی‌الرغم ، اس نے اپنی تعلیمات کے پرچار کے لئے سنسکرت زبان استعمال نہ کی بلکہ بنگالی سے کام لیا - وہ ویدوں اور پورانوں سے زیادہ ودیا پتی اور چنڈی داس کی تحریروں کا عاشق تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے پیروکار اور پھر آگے ان کے چیلے بنگالی زبان کی نشوونما میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے -

وشنو مت کا تجزیہ کیا جائے تو وہ قریب قریب مسلم صوفیا کے مسلک کا بنگالی روپ نظر آئیگا - زبان اور موضوع کے اعتبار سے صوفیا کی غزلیات ، اور وشنوؤں کی پداولیاں بڑی حد تک ایک ہی ہیں - صوفیوں کی مے اور ''شرب،، ویشنووں کے ہاں پریم اور پریتی میں ڈھل جاتی ہے - صوفیوں کے ''عاشق'' اور ''معشوق'' یہاں ''رادھا'' اور ''کرشن'' کا روپ دھار لیتے ہیں -

"ھجر" اور "وصال" ہندی میں آ کر "برہ" اور "ملن" ہوجاتے ہیں۔ ویشنووں کے رادھا اور کرشن وہ رادھا اور کرشن نہیں ہیں جو پورانوں میں ہمیں ملتے ہیں۔ ویشنووں کی پداولیوں میں وہ بالترتیب انسانی روح اور خداوند کے استعارے ہیں۔ کرشن کی بنسری نوائے خداوندی ہے۔ رادھا اور کرشن کے بیچ دریائے جمنا پڑتا ہے جس سے مراد ہے دنیا یا دنیاوی زندگی، جو روح کے پرواز کرکے خالق حقیقی سے جا ملنے کی راہ میں حائل رہتی ہے۔ تاہم بنسری کی آواز روح یا آتما تک پہنچ ہی جاتی ہے اور اسے وہ بھی لیتی ہے۔ ندائے خداوندی اس دنیا کے اور چھور بھی لیتی ہے اور روح اپنی محکم آرزو کے بل پر اڑ کر خداوند کے پاس پہنچ ہی جاتی ہے۔ شاعر اسی لئے تو کہتا ہے:

"تم دوسرے کنارے بیٹھے بنسی بجا رہے ہو

میں سنتی ہوں لیکن میں ابھاگن تیرنا نہیں جانتی"

کیا ان رادھا کرشن کو پورانوں کے رادھا کرشن سے کوئی نسبت ہے؟ جیسے عربی لفظ "اللہ" فارسی میں "خدا" ہو جاتا ہے (جس کی اصل سنسکرت "سدھا" ہے) اسی طرح صوفیا کے عاشق اور معشوق، وشنووں کے رادھا

اور کرشن بن گئے ہیں۔ اگرچہ نام وہی ہیں لیکن ویشنوؤں کے ہاں کرشن کی بنسری وہی معنی رکھتی ہے جو مولانا روم کی مثنوی میں "نے" کو حاصل ہے۔

اب ہم ویشنو ادب کی اہم شاخوں میں سے ایک شاخ کو لیتے ہیں۔ وہ ہے سوانح : ویشنو اسے "مہاجن چرت" کا نام دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں اس کا مثیل "تذکرۃ الاولیا" ہے۔

جس طرح گوڑوں کا ویشنو مت پرانے ویشنو مت سے جدا ایک چیز ہے اسی طرح "مہاجن چرت" ہرشا چرت یا رگھو بنس سے مختلف ہے۔

لیکن ان سوانح کا طرز بیان وہی ہے جو "تذکرۃ الاولیا" کا ہے۔ "ادوتیاپرکاش (۱۵۶۸)" "چیتنیابھگوت" (۱۵۷۵)، "چیتنیا چرتامرت (۱۵۸۵) میں حقیقت نگاری اور معجزوں کی وہی آمیزش ہے۔ یہ کہنا صاف تنگ نظری اور جہالت ہے کہ ان شعرا نے "تذکرۃ الاولیا" کا مطالعہ نہیں کیا تھا جب کہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ انہوں نے "مثنوی" پڑھی تھی۔

مسلمانوں نے بھی ویشنو طرز میں اپنا کلام لکھا اور اس طرح نئے بنگلہ ادب میں براہ راست اضافے کئے۔ اس

کی سب سے نمایاں مثال علاول کے ''پد'' گیت ھیں ۔ علاول نے مسلمان مذھبی گیت ''تحفہ'' کے نام سے بھی لکھے ۔ اس کا سبب صوفی ازم اور ویشنوازم کی باھمی مشابہت ھے۔ ویشنومت کی روح میں تصوف کے جذبات و خیالات سرایت کئے ھوئے ھیں ۔ مثال کے طور پر جس طرح شراب کو جسے اسلام نے ممنوع قرار دیا ھے، صوفی ادب میں استعارہ کا رنگ دے دیا گیا ھے، اسی طرح ویشنو ادب میں رادھا کرشن کو عاشق اور معشوق کے رنگ میں پیش کیا گیا ھے۔ بلکہ جو مسلمان صوفی ادب پڑھتے تھے وہ ویشنو شاعر نہیں بن گئے بلکہ وہ مسلمان شاعر ھی رھے ۔ گو انہوں نے 'ویشنوی طرز' کے گیت ضرور لکھے ھیں ۔

مختصر الفاظ میں یہ تھا اس زمانے کا ثقافتی ماحول جس کے شہ پاروں کا ذکر ھم اگلے باب میں کریں گے ۔

باب سوم

خود مختار بنگال کے مسلمانوں کا بنگالی ادب

(شاعری اور شعراء)

یہ بڑی بد قسمتی کی بات تھی کہ انیسویں صدی کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی طرح انگریزی تعلیم کی طرف رجوع نہ کیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ گئے ۔ انہوں نے ایسی کتابیں اور مسودے جمع کرنے شروع کردئے جن کی مدد سے وہ اپنے ماضی کو زندہ کرسکیں ۔ اس تلاش میں اتفاقی طور پر مسلمانوں کی بعض تصانیف بھی ملیں ، لیکن چونکہ اس کے لئے بالارادہ کوئی کوشش نہیں کی گئی اس لئے بہت سی تصانیف تلف ہو گئیں ۔ اگر عبدالکریم مرحوم (۱۸۶۹—۱۹۵۳) مسلمانوں کی تصانیف جمع کرنے کا کام شروع نہ کرتے تو ہماری ثقافتی میراث بہت سی عمدہ تصانیف سے محروم ہوجاتی ۔ فی الوقت ہماری معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ ان ہی کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ذاتی طور پر

چاٹگام میں جمع کیا۔ اس دشواری کے باوجود مسلمانوں نے بنگلہ زبان اور ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں اور ان میں جو گرانقدر اضافے کئے ہیں ان کا صحیح اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر نیچے کیا گیا ہے:

۱۔ شاہ محمد صغیر یہ بنگال کے سب سے قدیم شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی طویل منظوم کہانی "یوسف زلیخا" سلطان غیاث الدین اعظم شاہ کے دور حکومت (۱۳۸۹-۱۴۰۹) میں لکھی جن کا ذکر وہ اپنے انتساب میں اس طرح کرتے ہیں:

دعا

میں والئی ملک کے سامنے سر جھکاتا ہوں

جس کے خوف سے شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں

بادشاہوں میں وہ سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے

لوگ اسے خدا کا اوتار سمجھتے ہیں

انسانوں میں وہ صداقت کا پیکر ہے

اس کا نام غیاث والئی ملک ہے

اس نے عابدوں کی یہ بات ثابت کردی ہے کہ

بادشاہ ہر شخص پر فتح حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن

اس کی خواہش ہے کہ اس کا اپنا بیٹا یا شاگرد اس پر فتح پائے -

چنانچہ اس نے بنگال اور گوڑ فتح کئے
اس کا دل نیکی اور شرافت سے معمور ہے،
وہ تمام خوبیوں کا مجسمہ ہے
اس کا چہرہ ماہ کامل کی طرح دمکتا ہے اور
اس کے الفاظ شیریں اور دلکش ہیں
وہ تمام خواتین کا مرکز توجہ ہے ،
قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ اس کی خوبیاں بیان کرے
اس نے تمام بادشاہوں پر فتح حاصل کی ہے
اس کے طبل جنگ زور زور سے بج رہے ہیں
وہ دشمنوں کو تباہ کرتا ہے لیکن اپنے پیروؤں پر شفقت کی نظر رکھتا ہے

" گوبلوں " کی طرح وہ اپنی رعیت پر حکومت کرتا ہے -
میں نے بہت سے لوگوں اور ان کے کارناموں کو دیکھا لیکن صرف وہی میری عقیدت کا مرکز ہے اور میرا ملجا و ماویٰ ......

محمد صغیر اس کا خادم ہے

اور اس کی عظمت کا نغمہ خواں ''

شاعر یہ فرض کرلیتا ہے کہ بادشاہ غیاث کے باپ کو اپنے بیٹے کے ہاتھوں شکست کھانے پر فخر تھا۔ بنگال کی تاریخ میں صرف ایک ہی غیاث الدین کا ذکر آیا ہے، جو اپنے باپ سکندر شاہ سے لڑا۔ اس طرح یہ ''غیاث،، غیاث الدین اعظم شاہ کے علاوہ اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔

اس نظم میں شاعر نے اپنے متعلق ذاتی حوالے نہیں دئے لیکن اس کی زبان کاتبوں کے اپنے اضافوں اور تبدیلیوں سے پاک ہے، جس سے اس کی صداقت کا پتہ چلتا ہے۔ شاعر نے اس میں بعض ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو آجکل صرف چاٹگام کی مقامی بولی میں مستعمل ہیں لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا پانچ سو سال پہلے یہ الفاظ صرف چاٹگام کی مقامی بولی ہی میں استعمال ہوتے تھے، کہیں اور نہیں۔ الفاظ یہ ہیں: ''کانے'' بمعنی ''کون''۔ ''ترنج،، (پھلوں کا بادشاہ) انگور۔ کاشیا بمعنی کاش کا پھول۔ ''کھوھامی،، بمعنی کہر آلود۔ ممکن ہے وہ چاٹگام کے باشندے نہ ہوں لیکن ان کے

طرز بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر وہ چاٹگام کے نہیں تو اس کے قریب کے کسی مقام کے باشندے ضرور ہونگے۔ خصوصاً اس حقیقت کے پیش نظر کہ ان کے تمام مسودے چاٹگام اور ٹپرا میں ملے ہیں۔

زیادہ تر امکان یہ ہے کہ وہ اولیائے کرام کے خاندان سے ہیں۔ اگرچہ ایسی نظمیں بہت کم ہیں جن میں انہوں نے اپنا تخلص دیا ہو لیکن بعض نظموں میں وہ اپنے لئے "شاہ" تخلص کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں: "شاہ محمد کہتا ہے کہ "یوسف زلیخا" کا قصہ مقامی زبان اور "دابار" نظم میں لکھا گیا ہے"۔

ممکن ہے انہوں نے اپنی تعلیم کا زمانہ کامیابی کے ساتھ ختم کرنے پر نظم کا عنوان اپنے پیر سے لیا ہو اگرچہ اس بات کا کوئی یقینی ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں۔

انہوں نے اس کا ذکر کہیں نہیں کیا کہ انہوں نے یہ نظم بادشاہ کی درخواست پر لکھی ہے، اسلئے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انہوں نے اسے اپنی مرضی سے لکھا لیکن "انتساب" کی آخری چار سطروں سے، جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے یہ ظاہر ہے کہ وہ باشاہ کے ملازم تھے۔

یہ بات عجب سی معلوم ہوتی ہے کہ اولیائے کرام کے خاندان کا ایک فرد نظم کے ذریعے مذہب کی اشاعت کرے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مقامی زبان بنگلہ میں نظم کو مذہب کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ زبان حق کو فنا یا فتح نہیں کر سکتی۔ "یوسف زلیخا" عشق حقیقی کی کہانی ہے اسلئے انہیں قرآن پاک کے قصہ کو عوامی زبان میں پیش کرنے میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔

اگرچہ ان کا اصل مقصد بنگلہ بولنے والوں کو ایک مذہبی کہانی سنانا ہے لیکن فنی اعتبار سے بھی یہ کہانی بہت کامیاب ہے۔ بائیبل اور قرآن نے یہ قصہ بڑے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فردوسی اور جامی نے اس موضوع پر بڑی طویل کہانیاں لکھی ہیں۔ صغیر، جامی کے پیش رو ہیں۔ یہ چیز تشنۂ تحقیق ہے کہ وہ کس حد تک فردوسی کے مرہون منت ہیں۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس نظم سے نہ صرف یہ کہ بنگال کی فضا ہماری نظروں میں پھر جاتی ہے بلکہ اس میں ایک بنگالی کردار بھی موجود ہے۔ یوسف علیہ السلام کو خریدنے والے سوداگر کا نام "منی رو" ہے یہ ایک بنگالی نام ہے اور دو بنگالی الفاظ "منی" اور "آرو" کا مرکب ہے۔

جب یہ دسنی روپے، پانو بیوں کا سودا کر اپنا تمام روپیہ خرچ کر چکا تو اس نے کہا میرے پاس اب اس "تامر ڈھیبو" (پیتل کا برتن) کے علاوہ اور کوئی چیز باقی نہیں - یہ اسکے بدلے میں لے لو - چنانچہ اسنے یوسف کو اس "ڈھیبو" کے بدلے میں خرید لیا - یہ "ڈھیبو" بنگال کی خاص صنعت ہے - یوسف کے چھوٹے بھائی 'ابن یمین' کی مدھو پور کے (کیا یہ ڈھاکہ والا مدھو پور تو نہیں؟) بادشاہ کی بیٹی 'بدھو پروا' کے ساتھ شادی بھی، خالص بنگالی عوامی قصہ ہے -

۲- زین الدین

یہ اس دور کا دوسرا نامور بنگالی شاعر ہے - فی الحال اس کی صرف ایک نظم "رسول وجے" ہی دریافت ہوئی ہے لیکن اسکا مسودہ بہت ہی شکستہ حالت میں ہے اور جس خط میں تحریر ہے اس کا پڑھنا بہت مشکل ہے - کاتب نے نص کے ساتھ اسقدر زیادتی کی ہے کہ اسکا صحیح صحیح سمجھنا دشوار ہو گیا ہے -

زین الدین گوڑ کے سلطان یوسف شاہ (۱۴۷۴-۱۴۸۱) کے درباری شاعر تھے - نظم میں وہ بادشاہ کے نام کا بار بار ذکر کرتے ہیں اس کے چند نمونے حسب ذیل ہیں :-

''سلطان فیاضی میں ہریش چندر اور شان وشوکت میں ''اندر'' کے هم پله هیں - وہ شاهوں کے شاہ هیں - عالی مرتبت شری یت یوسف خاں میری پرجوش عقیدت اور وجدان کا سرچشمه هیں - میں نے یه نظم صرف ان هی کی خاطر لکھی ھے - حسن سیرت میں وہ ''کل پترو،، - علم وفضل میں ''شکرا،، اور گیان دھیان ،، میں مھیش هیں - ،،

یا: '' شری یت یوسف خان لامحدود خوبیوں کے حامل هیں - وہ رسول پاک کی یه داستان بڑے شوق سے سنتے هیں،، -

چونکه شاعر نے هر جگه یوسف شاہ،، کے بجائے '' یوسف خان ،، استعمال کیا ھے اس لئے بعض محققین کا خیال ھے که یوسف خان سے مراد گوڑ کے بادشاہ یوسف شاہ نہیں - میرے نزدیک اس میں کسی شبه کی گنجائش نہیں - الفاظ '' راج رتنهه ،، اور '' راجشوری ،، صاف گوڑ کے بادشاہ کی طرف اشارہ کرتے هیں - شاید اس وقت یوسف خاں صرف ولیعهد هوں، بادشاہ نه هوں - ایک دوسرے مقام پر شاعر نے انهیں '' یوسف نائک ،، کهکر خطاب کیا ھے - قدیم بنگله میں '' نایک ،، کے معنی شهزادہ یا ولیعهد کے

ہوتے ہیں۔ مثلاً حسب ذیل شعر میں :

شری یت نایک شے جے نصرت خاں
"رچیاو پنچالی جبے گنیر ندان

"رسول وجے" طبعزاد نہیں ہے۔ شاعر نے اسے یقینا کسی فارسی نظم سے لیا ہے۔ لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے کہ یہ لفظی ترجمہ نہیں۔ شاعر نے امیر کی لڑائی کے بیان میں اسے کسی گمنام فارسی شاعر کی نظم سے اخذ کرنے کا اعتراف کیا ہے :

" کتاب میں بہت سی لڑائیوں کا حال درج ہے، لیکن میں نے اس جگہ ان میں سے چند کا حال بیان کیا ہے۔"

"منگلا نظموں" جیسے "منسا منگل" یا "چاندی منگل" کی طرح "وجے کنیا" وسطی عہد کے بنگلہ ادب میں ایک خاص قسم کی نظم ہے۔ اس قسم کی نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہیرو کی بہادری اور معجز نما کارناموں کا ذکر کرکے اس کی مدح سرائی کی جاتی ہے۔ زین الدین کی "رسول وجے" میں رسول کریم کے کارناموں کو اسی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناموں اور بعض تاریخی شخصیتوں کے علاوہ اس نظم

میں کوئی واقعہ تاریخ کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے
اگرچہ شاعر کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام کے تمام واقعات
کسی فارسی نظم سے ماخوذ ہیں - پوری کہانی اس
طرح پیش کی گئی ہے گویا کہ وہ رسول کریم کی
زندگی کا ایک واقعہ ہے - جب کہ انھوں نے ''جیکم،، کے بادشاہ
کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا - جیکم کی سلطنت
مدینہ سے بہت دور تھی - وہاں پہونچنے میں چھ ماہ کا
عرصہ لگتا ہے - شاعر مبالغہ کے ساتھ ایک خیالی سفر کا
حال بیان کرتا ہے - رسول کریم اپنے ہمراہیوں کیساتھ
اس سفر پر چلے - راستہ میں دریا اور پہاڑ آئے اور چند دن
بعد جیکم کے بادشاہ کے ایک جاسوس ، ماہی گیر سے ملے -
رسول کریم نے بادشاہ کو پیغام بھیجا جس میں اسے اسلام
قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی - جیکم کے بادشاہ بہرام
کو جب یہ پیغام ملا تو وہ بہت برہم ہوا اور رسول کریم سے
جنگ کرنے کی دھمکی دی - اس پر رسول کریم اپنے
ساتھیوں کے ساتھ اس کے ملک میں داخل ہو گئے -
طرفین کے سپاہی جنگ کرنے لگے - ایک خونریز لڑائی
ہوئی - جیکم کے بادشاہ کو شکست ہوئی کیونکہ مسلمان
فوج کی بہاری نے :

" انھیں خوفزدہ کر دیا اور وہ میدان جنگ سے اس طرح پلٹے جس طرح کہ ہوا کے سامنے پدما کی لہریں ایک دوسرے کو ٹکراتی جاتی ہوں ۔ "

لڑائی ختم ہونے پر دونوں فوجیں اپنے اپنے کیمپوں میں آرام کے لئے واپس ہوئیں ۔ تمام رات جنگ کی تیاریاں ہوتی رہیں ۔ دوسرے دن وہ پھر ایک دوسرے کے سامنے صف بستہ ہو گئیں ۔ اس طرح لڑائی کئی دن تک برابر جاری رہی ۔ بادشاہ جیکم کے تین بیٹے گرفتار ہوئے ۔ حریفوں نے حضرت علی رض پر بھی حملہ بول کر انھیں زخمی کر دیا ۔ لیکن وہ لڑتے ہوئے نکل گئے ۔ جب وہ رسول کریم کے پاس پہونچے اور رسول کریم نے اپنا ہاتھ ان کے زخموں پر پھیرا تو تمام زخم غائب ہو گئے ۔ اس کے بعد حضرت علی رض دوبارہ میدان جنگ میں پہنچ گئے اور پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے لڑنے لگے ۔ ہاتھیوں اور گھوڑوں کا صفایا بول دیا اور دشمنوں پر بڑی بڑی چٹانیں برسائیں ۔ اس طرح انھوں نے اپنے ہاتھ سے دشمنوں کے ہزاروں سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔

اس مقام پر قصہ اچانک ختم ہو جاتا ہے ۔

۳۔ مزمل: انہوں نے اپنا کلام پندرھویں صدی کے وسط میں لکھا۔ اس دور کے تیسرے نامور شاعر ہیں۔ ابتک ہمیں انکی یہ تصانیف ملی ہیں۔ (۱) "نیتی شاستر ورتا" (۲) ساعت نامہ (۲) "خان جان چرترا" جو چند اوراق پر مشتمل ہے اور کسی بڑی کتاب کا صرف ایک جزو معلوم ہوتی ہے۔ ساعت نامہ کے ایک باب کا نام "خان جان وا کہان،، ہے۔ چونکہ خان جان چرترا 'خان جان وا کہان، سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ابتداً وہ ساعت نامہ کا حصہ تھی۔ کسی کاتب نے اسے علیحدہ کتاب سمجھ لیا اور اس طرح وہ ایک علیحدہ کتاب سمجھی جانے لگی۔

"پنتی شاستر،، اور "ساعت نامہ،، کے بعض مقطعوں میں "یوسف،، اور "محمد شفیع" کا ذکر آتا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ کتابیں شاید تین مختلف اشخاص کی لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن مزمل کے مقطعوں کی تعداد اسقدر زیادہ ہے کہ سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ اصل مصنف مزمل ہے۔ دوسرے دو اشخاص نے کہیں کہیں اپنے اشعار کا اضافہ کردیا اور چند ایک اشعار میں اپنا تخلص بھی دیدیا۔ ان کے مقطعوں کے اور مزمل کے مقطعوں کے طرز ادا کے درمیان بین فرق ہونے کی وجہ سے

یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے ۔ اپنا نام کسی نامور شاعر کے ساتھ جوڑ کر اپنی شہرت کی خواہش کو پورا کرنے کا اس زمانے میں عام رواج تھا ۔ اس بنا پر تاریخ سنہ ۱۷۰۵ع ، جو مزمل نے کتاب کے آخیر میں دی ہے ، صحیح معلوم نہیں ہوتی ۔ محمد شفیع کے ،، نور نامہ ،، سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے نقل کئے جانے کی تاریخ وہی ہے جو یہاں مذکور ہے ۔ یہ نسخہ ۱۷۹۶ع میں تیار ہوا اگرچہ شفیع نے خود اسے تیار نہیں کیا کیونکہ وہ تقریبا پچاس سال پہلے ہی فوت ہوچکے تھے ۔ تاہم یہ تاریخ مزمل کے متعلق ہماری حالیہ تحقیق سے مطابقت نہیں رکھتی ہے ۔

بعد کے شعرا میں سے محمد مقیم نے پہلی مرتبہ مزمل کا ذکر کیا ہے ۔ چٹاگانگ کے پیشرو شعرا کا ذکر کرتے ہوئے مقیم نے اپنی کتاب ،، گل بکاؤلی ،، میں سید سلطان ، علاول اور دوسرے شعرا کیساتھ مزمل کا نام بھی لیا ہے ۔ دوسری کتاب ،، فیض المقتدی ،، سے ان ہی کے کہنے کے مطابق ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسے ۱۷۳۷ع میں لکھا ۔ ظاہر ہے کہ مزمل اس سے بہت پہلے گزر چکے تھے ۔

تو کیا مزمل سترھویں صدی کے شاعر ھیں؟ ,, ساعت نامہ ،، (۱۷۰۷ء) کے مسودہ کی نوعیت، انکی زبان اور انکے پیر کی تاریخوں سے معلوم ھوتا ھے کہ وہ اس سے بہت پہلے دور کے تھے - سترھویں صدی کی بنگلہ کے مقابلہ میں ان کی زبان یقیناً زیادہ پرانی ھے - انکے پیر کی تاریخوں سے ثابت ھوتا ھے کہ وہ سولہویں صدی کے ھیں - 'ساعت نامہ' میں ایک جگہ وہ لکھتے ھیں کہ انہوں نے یہ کتاب اپنے پیر شاہ بدرالدین کی ھدایت پر لکھی تھی -

پیر بدرالدین بدر عالم بہاری نے کالنا ضلع بردوان میں اسلام کی تبلیغ کی - ان کے بارے میں یہ سمجھاجاتا ھے کہ وہ چاٹگام بھی گئے تھے - بہت سے لوگوں کا خیال ھے کہ چاٹگام کے بدر شاہ (جنکا ذکر پنتھوں میں بدر عالم کے نام سے آیا ھے) اور بدرالدین بدر عالم بہاری ایک ھی بزرگ کے دو نام ھیں - ان کا انتقال سنہ ۱۴۴۰ء میں بہار میں ھوا اگرچہ ان کا ایک فرضی مقبرہ کالنا میں اب بھی موجود ھے - ظاھر ھے کہ ھمارا شاعر ان کے قیام کے زمانہ میں ان کا شاگرد ھوا - اس صورت میں مزمل یقینی طور پر ۱۴۴۰ء سے پہلے اور بعد میں زندہ تھے - اس سے ثابت

ہوا ہے کہ اگر وہ پندرھویں صدی کے اوائل میں نہیں تھے تو یقینی طور پر پندرھویں صدی کے وسط کے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکی زبان اسقدر پرانی ہے۔

شاعر ''مقیم،، کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چٹاگانگ کے باشندے تھے اور ایک صوفی شاعر تھے۔ ''ساعت نامہ'' سے یہ بات ثابت ہے۔ ''علم الساعت،، علم التصوف کی ایک کتاب ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اس نے اسے بنگلہ میں صرف اسوجہ سے لکھا ہے کہ عام لوگ اسے سمجھہ سکیں۔ البتہ اس کتاب میں اور دوسری چیزیں بھی شامل ہیں۔ مثلاً بارش کے متعلق توہمات۔ غسل کا بیان اور کنھجن کا قصہ۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اس نے اسے عربی سے ترجمہ کیا ہے لیکن یہ نظم بنگالی جذبات اور واقعات سے اسقدر پر ہے کہ اگر واقعی ترجمہ ہے بھی تو ایک عربی موضوع کو بڑی آزادی کیساتھ بنگالی ماحول کے مطابق ڈھال دیا گیا ہے۔

''نتی شاستر ورت،، میں بہت سی باتوں پر بحث کیگئی ہے۔ ان میں زیادہ اہم یہ ہیں :- چاند اور سورج گرہن، خواب، نیک او ربد فال، مکانوں کو آگ لگنا'' بحث اکبر،، وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ چاند قاضی: چاند قاضی کا نام بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے۔ سید علاؤالدین شاہ بادشاہ (۱۴۹۳-۱۵۱۹) کے تحت نودیپ کے قاضی تھے۔ ان کے نام ھی سے ثابت ھے کہ وہ خالص بنگالی تھے۔ جب وہ نودیپ کے قاضی تھے گوڑ کی ویشنو ازم پلی اور بڑھی۔ اس دوران میں چاند قاضی کو شہرت حاصل ہوئی۔ ان کو اب بھی اس دور کی ایک نادر تاریخی شخصیت کا درجہ دیا جاتا ھے۔

یہ معلوم نہیں کہ آیا چاند قاضی نے کوئی طویل نظم لکھی ھے یا نہیں۔ تاھم انھوں نے کافی پد کہے جن میں سے میں ایک دریافت ھوا ھے جو واقعی اچھی نظم ھے۔ اس میں مقامی چیزوں کو بانسری کے استعارہ کے ساتھ سمویا گیا ھے، جسے مولانا جلال الدین رومی نے اپنی ''مثنوی،، میں استعمال کیا اور جو فارسی صوفی شاعروں کی (غزلیات) کی یاد دلاتا ھے۔

۵۔ شیخ کبیر: شیخ کبیر نے بھی پد کہے۔ سلطان نصیرالدین نصرت شاہ (۱۵۱۹-۳۲) کے عہد حکومت میں ان کا عروج ھوا۔ اس قسم کے گیتوں میں انہیں مسلمہ حیثیت حاصل تھی۔ ان کا ایک ,, ھولی ،، گیت ,, گوڑ پرترنگینی ،، نام کے ویشنو مجموعہ میں شامل ھے۔ اس گیت کے مقطع میں

صرف "کبیر" نام آیا ھے لیکن طرز بیان سے یہ بات ظاھر کہ یہ کبیر سوائے شیخ کبیر کے اور کوئی دوسرا شخص نہیں - ایک گیت شاہ نصرت کی حمد وثنا پر ختم ھوتا ھے، جس سے یہ اندازہ ھوتا ھے کہ وہ بادشاہ کے ملازم تھے -

ڈاکٹر شہید اللہ کا خیال ھے کہ کاتبوں کی غلطی سے کوی شیکھر، شیخ کبیر میں تبدیل ھو گیا - ان کے خیال کی بنیاد یہ ھے کہ شیخ کبیر اور کوی شیکھر کا ایک شعر آپس میں ملتا ھے - لیکن سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ اگر کاتب کوی شیکھر کو شیخ کبیر میں تبدیل کرسکتے تھے تو کیا یہ امکان نہیں ھے کہ انہوں نے شیخ کبیر کا کوی شیکھر کردیا ھو؟ - اس بات کا امکان زیادہ قوی ھے - کیونکہ کوی شیکھر وسط سولھویں صدی کے شاعر تھے - اگر کوی شیکھر نے اپنے کسی گیت میں سلطان نصرت شاہ کا ذکر کیا ھوتا تو ھم ڈاکٹر شہید اللہ کے نظریہ کو زیادہ قرین قیاس تسلیم کرسکتے -

٦- افضل علی

افضل علی دور متوسط کے بنگالی ادب کے مشہور شاعروں میں سے ھیں - ایک ان کا "نصیحت نامہ" اور دو وشینو پد دریافت

ہوئے ہیں - ان میں سے ایک پد گیت وراجا سندر سانیال نے اپنی کتاب ,, مسلم ویشینوی شعرا ،، کی جلد ۳ میں لکھا ہے اور دوسرا ماہوار رسالہ ,, بھارت ورش ،، کے پوش نمبر ۱۳۲۵ (بنگالی سال) میں شائع ہوا تھا -

وہ چاٹگام کے ستکانیا پولیس تھانہ کے گؤں ملوآ کے رہنے والے تھے - انکے والد کا نام بھنگو فقیر تھا - وہ خود ایک عالم مسلمان اور ولی اللہ تھے - اور شاہ رستم کے مرید- شاعر نے انہیں ایک مشہور ولی اللہ بتایا ہے جو اسرار الٰہیہ سے واقف تھے- اب بھی ان کی قبر وہاں موجود ہے اور ستکانیا میں انکے نام کا ایک بازار بھی ہے- مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ یہ درویش تقریبا چار سو سال پہلے گزرے ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ہماری تاریخ کے شروع دور میں گزرا ہے -

' نصیحت نامہ، کا مسودہ تقریبا دو سو سال پرانا ہےاور ایک دوسرے شاعر محسن علی نے اسے لکھا تھا - انہوں نے کتاب میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ۲۴ ماگھ (بنگالی مہینہ) کو نقل کی گئی - جس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ ۱۱۲۴ (بنگالی) یا ۱۶۶۲ء میں نقل ہوئی یا پھر ۱۰۲۴ (بنگالی)

یا ۱۶۶۲ء میں ۔ رستم شاہ کے متعلق جو تاریخیں لوگوں کی زبانی معلوم ہوئی ہیں ان سے نیز انکے ایک مقطع سے جس میں سید فیروز شاہ کا ذکر آیا ہے یہ طے ہوجاتا ہے کہ افضل کسی صورت میں بھی سترھویں صدی کے شاعر نہیں تھے ۔ علاوہ ازیں یہ بھی ظاہر ہے کہ فیروز شاہ انکے پیر نہیں ہوسکتے کیونکہ عام طور سے کسی شخص کے دو پیر نہیں ہوتے ۔ ہمیں یہ پہلے ہی معلوم ہے کہ ہمارے شاعر کے پیر رستم شاہ تھے ۔ اس لئے یہ فیروز شاہ ''گوڑ،، کے بادشاہ فیروز شاہ (۱۵۳۲-۱۵۳۳) ہیں ۔ چونکہ شاعر نے فیروز شاہ کو سلطان نہیں کہا بلکہ سید کہا ہے اسلئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ شہزادہ تھے اس وقت شاعر کو ان سے کچھ امداد ملی ہوگی ۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ چٹاگام کے ایک دوسرے شاعر شری دھر نے فیروز شاہ کو شہزادہ، کہکر خطاب کیا ہے۔

فی الحقیقت 'نصیحت نامہ' اخلاقی نظم ہے جس میں مذہبی تعلیم دی گئی ہے۔ درویش رستم خواب میں آتے ہیں اور انہیں تعلیم دیتے ہیں اور بقول شاعر وہ جو کچھ سیکھتا ہے اسے محض بیان کردیتا ہے ۔ انھوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ قرآن پاک اور سنت رسول کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق

شروع زمانہ کی تحریروں ھی میں ملتی ھیں۔

ان میں سے بعض خصوصیات حسب ذیل ھیں :—

(الف) 'رسول وجے' میں 'وہ تنھا کے' (اس کو) اور 'راجا کے' (بادشاہ کو)—(مفعولی حالت) کے بجائے ھمیشہ 'تنھا کا' اور 'راجک' استعمال کرتے ھیں۔

(ب) مخاطب کے لئے فعل ھمیشہ "سی" پر ختم ھوتا ھے مثلاً 'کرسی'، 'ھاؤسی' وغیرہ۔

(ج) متکلم کے لئے فعل کو نون غنہ سے لکھا گیا ھے۔ مثلاً 'دیوم' کی جگہ قدیم شکل 'دیوں'۔

(د) میتیھلی زبان کی طرح (ش) کو (کھ) میں بدل دیا گیا ھے۔ مثلا "شدھا بریکھے"

(ہ) بنگلہ لفظ 'وواہ' کے بجائے فارسی لفظ 'شادی' استعمال ھوا ھے۔

(و) ضمائر حسب ذیل طریقوں سے لکھے گئے ھیں :-
امی، تمی، موئی، وغیرہ

"ودیاسندر" متذکرہ بالا (الف) (ب) (ج) اور (و) میں مذکورہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ھین۔

(الف) پرانے افعال، مثلاً "لکھی" کے بجائے "پیکھی" (دیکھ کر)

ھانتے (سے) کرانتے (کرتا ھے) بھیلا (تھا)
وغیرہ -

(ب) لاحقہ کےلئے کھنڈاؤ، وغیرہ -

''ودیاسندر،، بہت پرانا قصہ ھے - ''واہن،، کی ''چوراپنیاشیکا،، میں شاید اسکی سب سے پرانی مثال ملتی ھے - لیکن یہ معلوم نہیں کہ آیا سبرید خاں نے آسے پڑھا تھا یا اپنی کہانی کسی اور جگہ سے لی تھی - ھر حصہ کے شروع میں سنسکرت اشلوکوں کے استعمال سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ آسنے اپنے منظوم ڈرامہ کا قصہ کسی سنسکرت کتاب سے لیا تھا - ھر سنسکرت اشلوک میں مابعد کہانی کا لب لباب موجود ھوتا ھے -

اس کے علاوہ ''ودیا سندر،، کہانیوں میں سے دو سولھویں صدی میں منظوم ھوئیں اور دو سترھویں صدی میں - ھم سولہویں صدی کی دونوں نظموں کا پہلے ھی ذکر کرچکے ھیں جن میں سے ایک دویجا شری دھر کی ھے اور دوسری کوی کانکا کی - دوسری دو ''ودیا سندر،، گووند داس اور کرشن رام داس نے سترھوس صدی میں لکھیں - ان میں سے کسی کی زبان اتنی پرانی نہیں جتنی کہ سبرید خاں کی -

''ودیا سندر،، محض منظوم قصه نهیں - اس میں ڈرامائی خصوصیات بھی هیں - سنسکرت میں اسٹیج کی هدایات هیں - سندر، مالنی، وغیرہ کے اسٹیج پر آنے اور اسٹیج سے جانے کی هدایتیں دی هوئی هیں - قصه ڈرامه کے سین کی طرح معلوم هوتا ہے۔ شاعر کو اس کا احساس تھا - چنانچه اس نے اس نظم کو ''منظوم ڈرامه،، کہا ہے۔

گو ودیا سندر اس دور کا عام موضوع ہے لیکن سبرید خاں نے اس میں کافی رد و بدل اور اضافه کیا ہے۔ ان کی نظم میں سندر، وجے نگر کے راجه، گنا سر اور رانی کلاوتی کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جب وہ بڑا هوکر بڑا عالم اور شاعر هوا تو اسکو 'ودیا پتی، کا خطاب ملا - راجه رتناوتی پوری میں رهتا تھا -

ودیا، وکرما کیشری کی بیٹی تھی - دوسری جگه اس کا نام ''ویر سنہا،، دیا گیا ہے۔ اس کی ماں کا نام شیلا دیوی تھا۔ وہ اوجانی کے شہر کانچی پور میں رهتے تھے - ودیا بھی بڑی جید عالم هوئی او ودیا وتی کا لقب پایا - اس نے تمام همسایه ملکوں کو چیلینج بھیجا اور یه اعلان کیا که وہ اس شخص سے شادی کرے گی جو اس سے زیادہ عالم ثابت هوگا۔ جو شخص اس خبر کو لیکر جگه به جگه پھرا اسکا نام مادھو تھا - جب

سندر نے مادھو کی زبانی یہ خبر سنی تو وہ آجانی آیا ۔ شام کا وقت تھا ۔ آتے ایک مالن ملی ۔ اسنے مالن سے رات اس کے یہاں بسر کرنے کی اجازت چاھی ۔ مالن نے جواب دیا کہ کوتوال نے آتے اسکے گھر دیکھ پا یا تو وہ سب سے پہلے دونوں کو قتل کردیگا اور بعد میں راجہ کو اطلاع دیگا ۔ وہ کوتوال کے سامنے کیا عذر پیش کریگی یہاں قصہ اچانک ختم ہوجاتا ہے ۔

ودیا سندر، محض محبت کی داستان نہیں ھے ۔ جسم و روح کی ملاقات کو تمثیل کے طور پر پیش کیا گیا ھے ۔ اس میں تاریخی صداقت نہیں ۔ یہی وجہ ھے کہ مختلف شعراء نے اپنے اپنے طریق پر مختلف واقعات بیان کئے ھیں ۔ اگر یہ ایکہ تاریخی حقیقت ھوتی تو مقامات اور اشخاص کے نام اسقدر مختلف نہ ھوتے ۔

سبرید خاں کا اصل کمال یہ ھے کہ اس نے اسے ڈرامہ کے رنگ میں پیش کیا ھے ۔ اس کی روحانی اھمیت حسب ذیل ھے :—

افلاطون نے " پاک روح اور خوبصورت جسم " کے امتزاج کو کامل انسان بتایا ھے ۔ در حقیقت انسانیت کی تکمیل بھی

اسی وقت ھوتی ھے - جب جسم انسانی کسرت کے ذریعہ حسین و
سڈول بن جائے اور دماغ علم و حکمت کے زیور سے آراستہ
ھو - '' ودیا سندر '' میں افلاطون کا بتایا ھوا انسانیت کا یہی
اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا گیا ھے - ''سندر'' انسانی جسم کا اعلیٰ ترین
نمونہ ھے اور ''وجیا'' روح انسانی کی بہترین مثال - تمام ودیا سندر
قصوں میں جسم و روح کے امترج کے ذریعہ انسانیت کی
اسی تکمیل کا حال بیان کیا گیا ھے -

علاوہ ازیں صوفی عام طور سے محبت کے قصوں کو استعارتاً
پیش کرتے ھیں - یہی وجہ ھے کہ صوفیوں نے عشق
خداوندی اور انسانی روح کے اظہار و تجزیہ کے لئے ''لیلیٰ مجنوں'' -
'' یوسف زلیخا'' کے قصے اپنائے -

(ب) ''رسول وجے'' : رسول وجے کا مسودہ بھی بڑی خراب
وخستہ حالت میں ھے - اس کے صرف بارہ صفحات (۲۱--۳۲)
ھیں - تاھم اس کا مطلب سمجھنا مشکل نہیں - اس کا واحد مقصد
رسول کریم کی جنگی فتوحات کی مدح سرائی ھے - ایک جگہ
کتاب کو '' جنگ نامہ '' بھی کہا گیا ھے اور دوسری جگہ
'' رسول وجے '' کیونکہ اس قسم کے قصے پہلے بھی لکھے
جا چکے تھے اور وہ سب کے سب '' رسول وجے '' کے نام سے

مشہور تھے۔

ظاہر ہے کہ نام سے کتاب کے مضمون میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ شاعر کا مقصد رسول کریم کی فتوحات کی مدح کرنا ہے ۔ بعینہ وہی جوزین الدین کی "رسول وجیے" کا مقصد ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ۔ شعریت اور علمیت کے اعتبار سے سبرید خاں کی نظم زین الدین کی نظم سے بہتر ہے ۔

(ج) حنیفہ اور کائرا پری ۔ اوپر کی دونوں "پنتھیاں" سنسکرت کے الفاظ اور عبات آرائی سے پر ہیں ۔ اس نظم کی زبان سلیس اور شستہ ہے ۔ اگرچہ قرون وسطیٰ کی بنگلہ کی خصوصیات اس میں موجود ہیں ۔

کہانی یوں ہے : حنیفہ نے لڑائی میں راجہ سہی رام کی بیٹی جیگن عرف "پاک دامن" کائرا پری،، کو ہرا دیا اور بعد میں اس سے شادی کرلی ۔ حنیفہ نے بہت سی سلطنتوں کو فتح کیا اور وہاں کے بادشاہوں کو مسلمان کیا ۔ "مقابل حوائی" حنیفہ کا دن رات کا ساتھی تھا ۔ سہی رام پر حملہ کے وقت وہ زخمی ہوگیا ۔ شاہ پری کی بیٹی کائیرا پری حنیفہ پر عاشق ہوگئی اور اسے بھگا لیجانا چاہا ۔ جب حنیفہ اپنی "ٹانگی" (ڈولی) میں زخمی اور بے ہوش پڑا تھا کائرا پری 'ٹانگی' میں

داخل ہوئی اور اسے اپنی قلمرو میں اٹھا کر لے گئی - جیگن اور مقابل حلوالی حنیفہ کے ساتھ تھے لیکن انہیں اس کی خبر نہ ہوئی کہ اسے کب اور کس طرح چرایا گیا - جب انہیں اس چوری کا علم ہوا تو ان کے غم کی انتہا نہ رہی -

حضرت علی رض کو اس کی اطلاع ملی - وہ رسول کریم کے روضہ پر تشریف لیگئے اور فوراً سمجھ گئے کہ کائرا پری حنیفہ کو اپنے گھر، شہر "روکم" لے گئی ہے اور صرف جیگن اسے بچا سکتی ہے - اسلئے جیگن اس جگہ پہنچی - بادشاہ "روکم" سے لڑی اور اسے مشرف بہ اسلام کرلیا -

اس جگہ پہنچ کر "پنتھی" ختم ہوجاتی ہے -

چاٹگام کے باشندوں میں مشہور ہے کہ حنیفہ اور کائرا پری کی "ٹانگی" ضلع کی جنوب مشرقی سرحد کے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر اب بھی موجود ہے - اگر کوئی شخص وہاں پہونچنا چاہے تو اس پر ہر چہار طرف سے بڑے بڑے پتھروں کی بارش ہونے لگتی ہے - وہاں شاہ بربر دیپ (شاہ پری کا جزیرہ) ایک جزیرہ ہے - کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آیا کہانی اس جزیرہ کے گرد گھومتی ہے یا نہیں - ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آیا "روکم" اراکان کے قدیم نام

"روکھئنگ ، یا ' روشنگ ، کی بگڑی ہوئی صورت ہے ۔

۱۔دونا غازی: ان کی نظم کا عنوان "سیف الملک بدیع الجمال" ہے۔ سترھویں صدی کے مشہور بنگلہ شاعر علاول نے بھی اس موضوع پر ایک نظم لکھی تھی ۔ علاول کی اس دور میں شہرت اوراس شاعر کے کلام سے ہماری کافی واقفیت نہ ہونے کی بناء پر ہم نے اپنی کتاب "اراکان راج شبھے بنگلہ ساھتیہ" میں اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ دونا غازی اس کے بعد کے دور میں گزرے ہیں ۔ لیکن اس کتاب کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہماری پہلی رائے غلط تھی ۔ ہم نے اپنی پہلی کتاب میں بھی کہا تھا کہ نظم میں کوئی تخلص نہیں ہے ۔ لیکن اب مجھے نظم میں کئی ایک مقطعے ملے ہیں ۔

نظم کا مسودہ بہت پرانا ہے۔ شاید دو سو سے دو سو پچاس سال پرانا ۔ اس میں ٥ سے ۱۸٥ صفحات ہیں ۔ اندر کے چند صفحے بھی غائب ہیں ۔ ایک جگہ کاتب کا نام "شار حین ثناء اللہ ۔ سنگ : لوتالی" لکھا ہے ۔ طارق میاں نے جو ضلع ٹپرا کے علی گنج کرو ٹریننگ سکول میں ماسٹر ہیں اسے مجتمع کیا ۔

جدید تحقیق یہ ہےکہ (اگرچہ یہ قطعی طور پر قابل اطمینان بات نہیں) کہ شاعر دونا غازی ضلع ٹپرا کی سب ڈویژن چاندپور کے تھے مگر سب ڈویژن کے چند معمر لوگوں کو ان کا نام ابتک یاد ہے۔ بقول ان کے یہ شاعر دوسو سال پہلے گزرا ہے۔ چونکہ اس مسودہ کا شروع اور آخر نہیں اور اس کا دوسرا کوئی مسودہ ملا نہیں، اسلئے ہمیں خالص اندرونی شہادت پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ اس نقطۂ نظر سے شاعر قطعی طور پر علاول کا پیشرو تھا۔ کلام میں ایسی یکسانیت نہیں ملتی جس کی بناء پر یہ سمجھا جا سکے کہ وہ ایک دوسرے کے کلام سے واقف تھے۔ دونوں کا مأخذ کوئی فارسی نظم ہے۔ دونوں نے ناموں کو مثلاً 'مالک' اور 'سید' کو تھوڑے فرق کے ساتھ لکھا ہے۔

شاعر کی قدامت کے بعض شواھد سے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ دونا غازی علاول سے پہلے گزرے ہیں۔ ان کی زبان کی "پراکرت" خصوصاً بحر کی بےقاعدگیاں۔ قوافی کا غیر یقینی ہونا، اور بہت سے پرانے الفاظ اور فقروں کا استعمال ان کے وسط سولہویں صدی کے شاعر ہونے کا پتہ دیتے ہیں، اور انہیں خود مختار بنگال

کے شعراء کی صف میں لا کھڑا کرتے ھیں۔ ان خصوصیات کی چند مثالیں حسب ذیل ھیں:

۱ - مفعولی حالت میں الفاظ کو پرانے طریق "کے" پر ختم کرنے کے بجائے "ک" استعمال کرتے ھیں مثلاً "پتیکا"۔ "دوھا کا" وغیرہ۔

۲ - فعل استمراری کو "آنیچھی" سے ختم کرنے کے بجائے وہ "انتی یا انیتی" پر ختم کرتے ھیں مثلاً "نچانتی سندری انیتی" وغیرہ۔

۳ - لاحقہ "دیا" کے بجائے وہ پرانا طریقہ "دی" استعمال کرتے ھیں۔

ھمیں اس کی کہانی دھرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ھم دوسری جگہ اسے دے چکے ھیں۔ اگرچہ کہانی تقریباً وھی ہے جو علاول کے یہاں ھے لیکن دونوں کا طرز بیان بنیادی طور پر مختلف ھے۔ علاول کی زبان سادہ اور پرانی ھے اور علاول قطعی طور پر زیادہ بہتر شاعر ھیں۔

۹۔شیخ فیض اللہ: شیخ فیض اللہ کو خود مختار بنگال کے شاعروں میں بڑا اھم مرتبہ حاصل تھا۔ ابتک ھمیں انکی پانچ نظمیں ملی ھیں۔ جو یہ ھیں:-

(الف) "گورکھشا وجے یا گورکھا وجے۔"

(ب) " غازی وجے "

(ج) " ستیه پیر "

(د) " جینبر چوتیشا "

(ہ) " راگ نامه "

ایک مرتبه میں نے " ستیه پیر " کے چند صفحات ایک دوسری پنتھی، "منوهر مادهو مالتی" کے ساتھ دیکھے تھے جسے ۱۱۰۱ ماگھ (۱۷۰۹ء) کے مہینه بیساکھ میں پراگل پور، چاٹگام کے 'شری ابوالعلی'، نے نقل کیا تھا۔ انتہائی کوشش کے باوجود مجھے یه دونوں مسودے نه مل سکے۔ میں " ستیه پیر " کے شروع کے چند شعر نقل کر سکا جو حسب ذیل ہیں:-

گورکھا وجوئے آدے مانی شدھو کاتا
کاھی لام شابھا کوتھا شنی لام جوتا
کھونتا دوریر پیر اسماعیل غازی
غازیر وجوئے شیہو موکو ھوئیلا راجی
اے بے کوھی ستیا پیر اپور بوکوتھان
دھانا بادے شنی لے پا توک کھانڈون
منی راشا بیدو شوشنتی شوکے کوھے شون
شیخے فیض الله بھابے بھابے ڈھاکا مون

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فیض اللہ نے اپنی
"ستیہ پیر" ۱۳۶۷ یا ۱۳۹۷ (شاکا) مطابق ۱۵۳۵ء یا ۱۵۷۵ء
میں لکھی - مجھے ابتک اس نظم کا نسخہ نہیں مل سکا -
ڈاکٹر شوکمار سین نے کسی اور فیض اللہ کی ایک "ستیہ پیر" نظم
دریافت کی تھی جو ان کے کہنے کے مطابق مغربی بنگال کے تھے۔ یہ
بات تصفیہ طلب ہے کہ آیا مشرق بنگال کے فیض اللہ اور مغربی
بنگال کے فیض اللہ ایک ہی شخص کا نام ہے یا دو کا -
"گورکھا وجے" ان کا سب سے مشہور کلام ہے - "وانگیہ
ساھتیہ پریشد" نیز "وشواوارتی" نے اس کتاب کو مرتب
کیا اور چھاپا ہے۔ اس پر ہم بعد میں بحث کریں گے -

ہمارے پاس شیخ فیض اللہ کی "غازی وجے" کا کوئی
نسخہ نہیں، اوپر نقل کئے ہوئے اشعار میں شاعر نے کہا ہے
کہ اس نظم میں اس نے "کنتادوار" کے پیر اسماعیل غازی کے
کارناموں کو بیان کیا ہے - اسماعیل بنگال کی مشہور
تاریخی شخصیت ہیں۔ انہوں نے سلطان بربک شاہ (۱۳۵۹-۷۴)
کے عہد حکومت میں شمالی بنگال میں اسلام کی تبلیغ کی اور
سلطان کے ایک جنرل کی حیثیت سے بھی کام کیا - کسی
نامعلوم سیاسی وجہ سے ۱۴۷۴ء میں سلطان کے حکم

سے انہیں قتل کروادیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا سر
''کنتادوار'' ضلع رنگپور، میں دفن کیا گیا اور ان کا دھڑ'' گئومندرن''
(ضلع بردوان) میں۔ اس طرح اسماعیل غازی کے ان دو مقامات پر
دو مقبرے ھیں ۔ اس سے معلوم ھوتا ہے کہ شیخ فیض اللہ
اسماعیل غازی کے ھمعصر نہیں ھوسکتے ۔ انھوں نے یقینا
''غازی وجے'' غازی کی شہادت کے بہت بعد شاید ۱۰۷۰ء کے
لگ بھگ لکھی۔ اس طرح اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ انکی
''ستیه پیر'' ۱۰۷۰ء میں لکھی گئی ''غازی وجے'' اس طرح
ایک تاریخی قصہ ہے۔

''زینبر چوتیشا'' ایک نوحہ ہے۔ محرم کے المیہ کے بعد حضرت
زینب کے نوحہ کا بیان ہے۔ ''چوتیشا'' بنگلہ شاعری کی ایک صنف
ہے جسمیں چونتیس مصرعے ھوتے ھیں اور ھر مصرعہ نمبروار
بنگلہ حروف تہجی کے ایک حرف سے شروع ھوتا ہے۔ یہ
مرثئے ایک قسم کے طویل نوحے ھوتے ھیں۔ یہ نظم بھی
اسی قسم کی ہے۔ اسمیں کوئی دوسری نمایاں خصوصیت
نہیں۔

''راگ نامہ'' موسیقی سے متعلق ہے۔ شیخ فیض اللہ نے نظم
میں ھندوستانی کلاسکی موسیقی کے مختلف راگوں اور تالوں پر

بحث کی ہے۔ شاعر کے علم موسیقی کی گہرائی اور وسعت کا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی سب سے مشہور نظم "گورکھا وجے" ہے۔ اس کے بعض نسخوں میں ہمیں شیام داس، بھیم داس اور کوندرا داس کے بعض مقطعے بھی ملتے ہیں۔ اسلئے بعض ناقدین نے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ نظم کوندرا نے لکھی تھی۔ لیکن چونکہ زیادہ تر مقطعے، اور بعض نسخوں میں تمام کے تمام مقطعے فیض اللہ کے ہیں، یہ رائے یا تو دور از کار معلوم ہوتی ہے یا پھر اس کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے کہ بنگلہ ادب سے مسلمانوں کو نکال دیا جائے۔ ورنہ یہ ناقدین اس قسم کا ناقابل اعتبار نتیجہ کیونکر نکال سکتے تھے۔ ایک مقطع میں یہ کہا گیا ہے کہ فیض اللہ نے یہ کہانی کوندرا کی زبانی سنی۔ یہ بھی معنی خیز ہے۔ فیض اللہ، بھیم داس اور شیام، زمانۂ مابعد کے شاعر ہوں گے۔ جیسا کہ ان لوگوں کا قاعدہ تھا وہ اپنے ناموں کو فیض اللہ کے نام کے ساتھ جوڑنے کی خواہش کو نہ دبا سکے۔ جہاں تک کوندرا کا تعلق ہے یہ بہت ممکن معلوم ہوتا ہے کیونکہ فیض اللہ بہت پرانے شاعر تھے۔ کوندرا بنگلہ کی مشہور "مہا بھارت" کے مصنف مشہور شاعر کوندرا پرمیشور ہوں گے۔ انہوں نے "مہا بھارت

پنچالی'' حسین شاہ کے جنرل پراگل خاں، کے حکم پر لکھی تھی،
جنہوں نے ٹپرا اور چاٹگام کو فتح کیا تھا ۔ ان دو ضلعوں
کو فتح کرنے کے بعد پراگل خاں کو سلطان سے خطابات اور
اعزازات ملے اور انہوں نے شمال میں پراگل پور رهنا شروع
کیا جو چاٹگام کی عین مغربی سرحد پر واقع ھے۔ انکی اولاد اب
بھی وھاں رھتی ھے اور انکی مسجد اور تالاب اس دور کی یاد
دلاتے ھیں ۔ حسین شاہ نے ۱۵۱۹ء تک حکومت کی۔ تاریخ
میں لکھا ھے کہ پراگل خاں نے ۱۵۱۷ء میں ٹپرا اور چاٹگام
فتح کئے ۔ پراگل خاں کو ایسا ثقافتی ماحول پیدا کرنے میں
یقیناً پندرہ بیس سال کا عرصہ لگا ھوگا جس میں کہ ادبی شہ پارے
لکھنا ممکن ھوسکتے ھیں۔ ایک دن جب وہ ''مہا بھارت'' کا قصہ
سن رھے تھے انہوں نے اسے مختصراً سننے کی خواھش ظاھر کی۔
کوندرا کو اس کا اختصار کرنے کیلئے کہا گیا اور
انہوں نے ۱۵۴۰ء کے اندر اندر اسے پورا کر دیا ۔ اگر
فیض اللہ نے اپنی ''ستیہ پیر'' ۱۵۷۵ء میں (۱۵۴۵ء بھی
ھو سکتا ھے)، لکھی تو ممکن ھے کوندر اسے ان کی ملاقات
ھوئی ھو۔ اگر ''ستیہ پیر'' کی تاریخ تصنیف ۱۵۴۵ء ھے تو
اس بات میں ذرہ برابر شبہ نہیں رھتا ۔ ''گورکھا وجے'' ''ستیہ

پیر'' سے پہلے لکھی گئی - شیخ فیض اللہ نے یہ کہانی
گوندرا کی زبانی سنکر لکھی - بنگلہ ادب کی تمام اہم
تاریخوں میں اس کتاب کا ذکر ہے اور کہانی دی ہوئی ہے
اس کا عنوان گوپندرا چندرا یا گوپی چندر بھی ہو سکتا ہے
یہ شمالی ہند کی مشہور کہانی ہے۔

۱۰-دولت وزیر بہرام خان:

ہمیں اس شاعر کی صرف ایک
نظم ''لیلی‌مجنوں'' ملی ہے۔ یہ بڑی طویل نظم ہے - اپنی کتاب
کے دیباچے میں شاعر نے اپنے سابقہ حالات تفصیل کے ساتھ
دیئے ہیں - اس دیباچہ سے ہم نے حسب ذیل حالات
لئے ہیں:—

حمید خاں گوڑ کے بادشاہ حسین (۱۴۹۳—۱۵۱۹) کے
معزز درباری تھے - وہ ایک لائق مشیر اور شریف النفس
بزرگ تھے - سلطان کے حکم سے انہوں نے چٹا گانگ فتح کیا -
وہیں رہنے لگے اور اپنے نیک کام جاری رکھے - اس اثناء میں
گوڑ کے خراب دن آئے - حمید خاں نے بھی انتقال کیا - انکی
وفات کے بعد گوڑ میں متعدد خاندانوں کے حکمراں ابھرے اور
فنا ہوئے - آخر کار سور خاندان کے نظام شاہ چٹا گانگ کے
بادشاہ ہوئے - انکے محافظ دستہ میں سو آدمی تھے اور انکے

پاس لال اور سفید ہاتھیوں کی بڑی تعداد تھی۔ انھوں نے چٹا گانگ میں ایک قلعہ بھی بنوایا۔

مبارک خاں جو حمید خاں کی اولاد میں تھے اسوقت زندہ تھے۔ اس ضلع میں ان کا کافی نام تھا۔ نظام شاہ نے انھیں 'دولت وزیر' کا خطاب عطا کیا۔ اس خطاب کے ملنے کے چند سال بعد ان کا انتقال ہوا۔ اسوقت ان کے صاحبزادہ بہرام خاں یعنی ہمارے شاعر کی عمر سن بلوغ کو نہ پہونچی تھی۔ یہ سن کر نظام نے ازراہ کرم باپ کا خطاب بیٹے کو دیدیا۔ اس طرح شاعر "دولت وزیر بہرام خاں" کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ چٹا گانگ کے ستیا کنڈا پولیس اسٹیشن کا نظام پور پرگنہ اب بھی مشہور جگہ ہے۔ بہت لوگ کہتے ہیں کہ اس پرگنہ کا نام کسی نظام شاہ کے نام پر رکھا گیا تھا جو اس کا جاگیردار تھا۔ اس طرح یہ نظام شاہ شاعر کے سوا اور کوئی شخص نہیں ہوسکتا۔

سور خاندان نے بنگال پر ۱۵۳۹ سے ۱۵۴۴ تک حکومت کی۔ نصرت شاہ کی وفات پر ۱۵۳۲ء میں گوڑ میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس کی ابتدا ۱۵۲۶ء میں ہوئی جب نصرت شاہ نے چھوٹے بھائی محمود نے عبد البدر ہونے کا اعلان کیا

اور اپنے "بدرشاهی" سکے ڈھالنے لگا۔ اس محمود نے بعد میں نصرت شاہ کے بیٹے فیروز شاہ کو تخت سے اتارا اور مروا ڈالا اور ۱۵۳۸ تک گوڑ میں حکومت کی۔ ان پانچ سال میں طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ سور افغانوں نے بغاوت کی۔ سوروں کے گوڑ کے تخت پر بیٹھنے کے بعد یہ هنگامہ ختم هوا۔ ۱۵۵۳ء میں محمد خاں سورنے خود مختار هو کر شمس الدین محمد شاہ غازی کا لقب اختیار کیا اور چٹاگانگ پر حملہ آور هوا۔ بہت ممکن هے کہ اس نے اراکانیوں سے اس وقت اسے فتح کیا اور نظام شاہ سور کو صوبہ کا گورنر بنایا۔

جب ۱۵۵۵ء میں محمد خان چھپر گھاٹ کی لڑائی میں هیمو کے هاتھوں مارا گیا تو پھر آفت برپا هوگئی۔ هوسکتا هے کہ اسوقت نظام شاہ سور عملاً چٹاگانگ کا خود مختار بادشاہ هو۔ اس تاریخ وار سلسلہ حالات سے معلوم هوتا هے کہ شاعر کو نظام شاہ سے ۱۵۶۰ء کے لگ بھگ خطاب ملا۔ شاعر کی عمر اسوقت شاید پندرہ سولہ سال رهی هو۔ اگر اس نے اپنی "لیلیٰ مجنوں" اس کے پندرہ سال بعد لکھی تو هم اس کی تاریخ تصنیف ۱۵۷۵ء (تقریباً) فرض کرسکتے هیں۔

شاعر کے دادا حمید خاں چٹاگانگ کے قریب فتح آباد

میں رھنے لگے۔ھٹ ھزاری اور چٹاگانگ کے درمیان یہ ایک مشہور گاؤں ھے ۔ معلوم ھوتا ھے کہ ھمارے شاعر کے زمانے میں چٹاگانگ بڑھتے بڑھتے اس گاؤں تک پہونچ گیا تھا ۔ شاعر نے اسکا ذکر یہ کہکر کیا ھے کہ یہ شہر عالیشان عمارتوں سے بھرا ھوا ھے ۔ اس کے ایک طرف سمندر ھے اور دوسری طرف دریا ئے کرنا فلی ۔ شہر کے چاروں طرف ایک کھائی ھے ۔

ھو سکتا ھے کہ حسین شاہ کی فتح کے بعد چٹاگانگ کا نام فتح آباد ھوگیا ھو ۔ اس صورت میں اسکا مفتوح ھونا اس کے نام سے ظاھر ھے۔

''لیلی مجنوں'' جامی کی ''لیلی مجنوں'' کا آزاد ترجمہ ھے ۔ بعض مقامات پر وہ اصل سے بہت قریب ھے ۔ ھم اسکا ذکر دوسری جگہ کرچکے ھیں اسلئے اسے دھرانے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ یہ کہنا کافی ھوگا کہ شعریت ' نزاکت بیان ' متانت اور پاکیزگی ' جذبات کے لحاظ سے سولھویں صدی کے بنگلہ ادب میں اس کے ھم پلہ کوئی نظم نہیں ۔

۱۱- محمد کبیر: ان کے کلام میں صرف ''مدھومالتی'' اسوقت تک معلوم ھوئی ھے۔ اسے

شری عبدالعلی ساکن پرا گل پور، جٹا ڈنگ نے ماگھی ۱۱۰۱
(۱۷۳۹ء) کے بیساکھ میں نقل کیا۔ یہ مسودہ مارچ ۱۹۳۷
میں زورآور گنج (تھانہ سیتا کنڈ، چٹا ڈنگ) میں میری نظر سے
گزرا۔ لیکن مجھے اسے لینے کی اجازت نہ دیگئی۔ میں نے اس میں
سے چند آخری بند نقل کرائے جس میں مذکور ہے کہ یہ کتاب
۹۹۷ ھجری مطابق ۱۵۸۸ء میں لکھی گئی۔

مگر حال ھی میں اس کی تاریخ تصنیف کے متعلق شبہات
پیدا ہوگئے۔ مولوی عبدالکریم ساھتیہ وشارد مرحوم نے ۲۲
جولائی ۱۹۳۹ کو مجھے لکھا کہ انہیں اس کتاب کا ایک نسخہ
ملا ہے جسے وہ پچیس روپے نہ ھونیکی وجہ سے نہ خرید سکے۔
لیکن اس مسودہ کے آخری صفحہ سے انہوں نے مقطع نقل کرلیا
جو بہ ھزار کوشش نہ میری سمجھ میں آسکا اور نہ انکی، کیونکہ
میری رائے میں کاتب نے مادۂ تاریخ نقل کرنے میں کوئی
غلطی کردی تھی۔ اگر ھم اس کے الفاظ کو تھوڑے رد و بدل کے
ساتھ جیسا کہ میں نے کیا ھے، پڑھیں اوراحتیاط سے اسکے معنی
نکالیں تو معلوم ھوتا ہے کہ یہ مسودہ ۸۹۰ ھجری یا ۱۴۸۵ء
میں لکھا گیاتھا۔ اسطرح ان دو تاریخوں ۱۵۸۸ اور ۱۴۸۵ کے
درمیان ۱۰۳ سال کا فرق ہے۔ اب ھمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ان

میں سے کونسی تاریخ زیادہ قابل قبول ہے -

وجے گپتا اور وپرا داس پیپلاے نے اپنی "منسا منگل" بالترتیب ۱۴۸۴ء اور ۱۴۹۵ء میں لکھیں - کیا کبیر نے اپنی نظم ان دونوں سے پہلے لکھی ؟ اس سوال کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جاسکتا - ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کی زبان سے کبیر کی زبان زیادہ پرانی ہے - اسکی چند مثالیں حسب ذیل ہیں :-

۱ — مفعولی حالت میں "کے" بجائے کبیر پرانی شکل "ر" استعمال کرتے ہیں - مثلاً "کمار کا" "نری یا تیکا" وغیرہ

۲ — مخاطب کیلئے فعل میں وہ پرانے طریقہ سے لاحقہ لگاتے ہیں، مثلاً "جاناسی" (تو جانتا ہے) -

۳ — وہ نیم پراکرتی الفاظ کافی تعداد میں استعمال کرتے ہیں - وپراداس اور وجے گپتا کی زبان مقابلتاً زیادہ جدید ہے - یہ تمام خصوصیات انکے کلام میں موجود نہیں -

اس کتاب کے متعلق دوسرا مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ اس کی کہانی کس جگہ سے لی گئی - آیا کہانی کسی

فارسی نظم سے ترجمہ کی گئی یا کسی ھندی نظم سے؟ بعض مقطعوں میں انھوں نے صاف صاف کہا ھے کہ انھوں نے اصل کہانی فارسی بحر سے بنگلہ بحر میں منتقل کی ھے۔ لیکن ایک جگہ ان کا کہنا ھے کہ اصل کہانی ھندی میں تھی، اور انھوں نے بنگلہ بنچالی میں لکھا ھے۔

"پائما" (یا جیسا کہ ایک جگہ دیا گیا ھے— "فاطمہ") کے علاوہ تمام نام ھندی ھیں۔ اگرچہ فضا گل بکاؤلی میں دیئے ہوئے ماحول سے پیدا کی گئی ھے تا ھم بنیادی طور پر وہ ھندوانہ ھے۔ بہت ممکن ھے کہ اصل کہانی ھندی میں ھو اور کسی مسلمان شاعر نے اسے فارسی میں ترجمہ کیا اور اسے شاعر نے بنگلہ میں پیش کردیا۔ اس کی کہانی یوں ھے:-

منوھر سلطنت کانگڑا کے بادشاہ سورج بھان اور رانی کملا کے یہاں بڑی دعاؤں اور خیرات کے بعد پیدا ھوا۔ نجومیوں نے پیش گوئی کی کہ شہزادہ کا مستقبل بہت روشن ھے لیکن ساتھ ھی یہ بھی بتایا کہ ۱۵ سال کی عمر کو پہونچنے پر وہ ایک حسین خاتون کی تلاش میں سلطنت سے اڑ کر چلا جائیگا اور بعد میں واپس آ کر پھر اپنی سلطنت پر حکمرانی کرے گا۔

مادھو مالتی سلطنت مہاراس کے بادشاہ ابھی رام اور رانی روپس منجری کے یہاں پیدا ہوئی - وہ بھی بادشاہ کی اکلوتی بیٹی تھی - وہ غیر معمولی طورپر حسین تھی اور نجومیوں نے اس کے مستقبل کے متعلق بھی اسی قسم کی پیش گوئی کی تھی -

جب شہزادہ منوھر کی عمر پندرہ سال کی ھوئی تو بوڑھے بادشاہ سورج بھان نے فیصلہ کیا کہ شہزادہ کو سلطنت سونپ کر کسی جنگل میں چلا جائے اور اپنی باقی ماندہ عمر خدا کی یاد میں گزار دے- تاجپوشی کی رسم بر وقت مکمل ہوگئی - جب یہ رسم اور اسکا جشن ختم ھوگیا تو منوھر تھکن سے چور ھوکر اپنے باغ میں ایک بستر پر سوگیا - عین اسیوقت پریوں کا ایک جھرمٹ جو مادھو مالتی کے محل پر آڑتے ھوئے اسے اپنے باغ میں سوتا ھوا دیکھ آیا تھا ادھر سے گزرا اور منوھر کو باغ میں بیخبر سوتا ھوا دیکھا - وہ دونوں کا باھم مقابلہ کئے بغیر نہ رہ سکیں . . . چنانچہ انہوں نے شہزادہ کا پلنگ مادھو مالتی کے پلنگ کے برابر بچھا دیا - جب آدھی رات کے وقت ان دونوں کی آنکھ کھلی اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو ھر ایک نے دوسرے کو انسان سے بالا تر ھستی سمجھا - مادھو مالتی نے سمجھا کہ شہزادہ ضرور کوئی

گندھروا یا اندر ھے ۔ شہزادہ نے سمجھا کہ مادھو مالتی فرشتہ ھے ۔ اس کے بعد وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے ایک دوسرے کا حال معلوم کیا اور بعد میں دونوں میں اسقدر گہری محبت ہوگئی کہ انھوں نے آپس میں انگوٹھیاں اور بستر بدل لئے ۔ پریاں لوٹیں تو انھوں نے انہیں ایک دوسرے کے بستر پر سوتا دیکھا اور شہزادہ کو اسکی سلطنت میں پہونچا دیا ۔

صبح کے وقت دونوں بیدار ہوئے اور اپنے آپ کو تنہا پا کر سوچ میں پڑگئے کہ رات کو جو کچھ دیکھا تھا وہ حقیقت تھی یا ایک خواب ۔ لیکن اگر یہ خواب ہوتا تو انگوٹھی اور بستر کہاں سے آئے ۔ ؟ اس خیال سے وہ ایک دوسرے سے ملنے کیلئے بیچین ہوگئے اور انھوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا ۔ بادشاہ سورج بھان اور بادشاہ ابھی رام کو اپنے بچہ کی حالت کا علم ہوا ۔

منوھر ایک بھاری لشکر لیکر مادھو مالتی کی تلاش میں نکلا ۔ وہ ایک دریا کے کنارے پہونچا اور دریا میں ایک خوبصورت کشتی دیکھی ۔ وہ اور اسکے سپاھی کشتی میں سفر کو چلے ۔ لیکن راستہ میں ایک طوفان آگیا جس میں منوھر کے علاوہ، جو ایک شہتیر سے چمٹ گیا تھا، باقی تمام سپاھی

ڈوب گئے - جب منوھر کنارہ پر پہونچا تو اس کےسامنے ایک بہت بڑا جنگل تھا - اس نے ایک پگڈنڈی لی اور جنگل میں داخل ھوا — وھاں اس نے ایک '' تانگی ،، دیکھی جہاں اس کی ملاقات ایک حسین دوشیزہ' ''پائما'' (فاطمہ) سے ھوئی - وہ سلطنت جے بہار کے بادشاہ چندر سین کی لڑکی تھی - اسے ایک دیو نے اڑا کر اس '' تانگی ،، میں قید کر رکھا تھا - منوھر نے سوچا کہ ایک دوشیزہ کی محبت نے تو اسے گھر سے بے گھر کیا - اب دوسری دوشیزہ کی محبت اس کی جان ھی لینا چاھتی ھے - منوھرنے دیو کو ھلاک کیا - دوشیزہ کو اس کے چنگل سے رھا کیا اور اس سے معلوم ھوا کہ وہ مادھو مالتی کی سہیلی ھے - اس کے بعد منوھر ، پائما کو اس کے باپ کے یہاں لے گیا - وھاں مادھو مالتی سے اسکی ملاقات ھوئی - لیکن مادھو مالتی کی ماں کو یہ خوف پیدا ھوا کہ کہیں مادھو مالتی اپنے خاندان کی آبرو کو بٹہ نہ لگا دے - اس ڈرسے اس نے مادھو مالتی کو '' شک '' نامی چڑیا میں تبدیل کردیا - ''مانک یارش'' کے بادشاہ تارا چند نے مادھو مالتی کو اس روپ میں پکڑا اور اسے اس کے باپ کی سلطنت میں پہونچایا - بادشاہ نے اس چڑیا کو اپنے باغ کی مالن کے

گھر پر بیٹھا دیکھا اور تاراچند کی زبانی اس کا احوال سنا۔ اسکے بعد بادشاہ منوہر کو پائما کے باپ کے گھر سے لایا اور دھو مالتی سے اس کی شادی کردی۔

ہمارے شاعر کا انداز بیان نہایت قابل تعریف ہے۔

اختتامی بحث

سابقہ سطور میں ہم نے آزاد بنگال کے ادب اور ادبی شخصیتوں سے بحث کی ہے اور اگرچہ اس بحث میں ہم نے شاعروں کے طرز نگارش اور موضوعات کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے، لیکن یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلو پر مجموعی طور سے بھی نظر ڈال لی جائے۔

موضوعات کے لحاظ سے مسلم بنگالی ادب عموماً ہندوؤں کے ادب سے مختلف ہے۔ اور اس ادبی تفریق کی بڑی وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب اور معاشرے کا فرق ہے۔ مسلم بنگالی ادب کو آسانی کے ساتھ چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ بیانیہ نظمیں: یہ دو قسم کی ہیں:
مسلم یا اسلامی بیانیہ نظمیں مثلاً:
یوسف زلیخا از شاہ محمد صغیر
"حنیفہ و کائیرا پری" از سبرید خاں

سیف‌الملک　　　　از دونا غازی

لیلیٰ مجنوں　　　　از بہرام خاں

(ب) ہندوستانی یا ہندوانہ بیانیہ نظمیں :-

منوہر مدھو مالتی　　　　از محمد کبیر

ودیا سندر　　　　از سبرید خاں

۲ - مذہبی نظمیں : یہ تین قسم کی ہیں :

(الف) مذہبی احکام و مسائل پر جیسے :

نصیحت نامہ　　　　از افضل علی

(ب) تاریخ اسلام کے موضوع پر جیسے :

رسول وجے　　　　از زین‌الدین

رسول وجے　　　　از سبرید خاں

غازی وجے　　　　از شیخ فیض‌اللہ

(ج) ہندو تاریخ کے موضوعوں پر جیسے :

گورکھا وجے　　　　از شیخ فیض‌اللہ

۳ - ایسی نظمیں جن میں ثقافتی اتحاد نظر آتا ہے جیسے :

ستیہ پیر　　　　از شیخ فیض‌اللہ

پد اولی　　　　از چاند قاضی ، شیخ کبیر ،
اور افضل علی

۴ - مرثیہ : جیسے ” جنیبر چوتیشا “ از شیخ فیض اللہ

۵ - نجوم وغیرہ پر نظمیں جیسے :

(۱) ساعت نامہ از مزمل

(۲) نیتی شاسترا ورتا از مزمل

۶ - علم موسیقی پر نظمیں جیسے ”راگ نامہ“ از شیخ فیض اللہ -

اس فہرست کو دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کے اس دور کے مسلم بنگالی ادب کا بڑا حصہ بیانیہ اور مذہبی نظموں پر مشتمل ہے۔ اس دور میں ہندو مسلم ثقافتی اتحاد کے موضوع پر بھی نظمیں لکھی جانے لگی تھیں - محرم اور ضریح کے متعلق نظموں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا جس کا ثبوت ”جینبیر“ سے ملتا ہے۔ مسلمانوں نے علم نجوم اور علم موسیقی کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔

۱ - بیانیہ نظمیں

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مسلمانوں نے سب سے پہلے بیانیہ شاعری کی طرف توجہ کی - آج تک ہندوؤں اور مسلمانوں کی لکھی ہوئی جو کتابیں یا نظمیں دستیاب ہوئی ہیں ان میں سب سے قدیم نظم صغیر کی ”یوسف زلیخا“ ہے۔ اب

تک بنگال میں غیر مذہبی ادب کا رواج ہی نہ تھا۔ ہندو ادیب یہ تصور ہی نہ کر سکے تھے کہ ادب ایسا بھی ہوسکتا ہے جو محض خیال اور تصور پر مبنی ہو اور مذہب اس کا موضوع نہ ہو۔ اس جدت کا سہرا بنگالی مسلم ادیبوں پر ہے انہوں نے ہی سب سے پہلے یہ طرز شروع کیا۔ اس لئے مسلمانوں میں صغیر جیساشاعر پیدا ہوا۔ صغیر کو خود یہ احساس تھا کہ وہ ایک نئی بات کر رہا ہے اور اپنے دور کو لذت جمال سے روشناس کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ایک نئے دور کی ابتدا کی اور ایک نئی خواہش پیدا کی اور وہ خواہش تھی جمالیات کا ذوق۔ اس نظم میں اس نے لکھا ہے کہ ''یوسف زلیخا'' کی کہانی اسے قرآن شریف اور دوسری عربی، فارسی کتابوں میں ملی۔ لیکن اس نے اس کہانی کو ایسے طرز سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کو بالکل نئی نظر آئے۔ کیونکہ اس کہانی میں صغیر نے مذہبی رنگ کے حسن پرستانہ اور جمالیاتی جذبات بھی داخل کردئے ہیں۔ اگر ایک مذہبی کہانی کو اس طرح پیش کرنے پر لوگوں کو اعتراض ہو تو وہ ان سے معافی کا بھی خواستگار ہے اور اس کی استدعا ہے کہ اس کی لغزشوں سے درگذر کیا جائے اور اس کی خوبیوں کو قبول کیا جائے۔

"یوسف زلیخا" ایک ایسی کہانی ہے جس میں مذہبی رنگ بھی ہے اور حسن و عشق کی چاشنی بھی لیکن شاعر نے اس کو صرف حسن و عشق کی کہانی کے طور پر پیش کیا ہے۔

صغیر کی اس کامیاب کوشش کی پیروی اور بھی بہت سے شاعروں نے شروع کردی۔ جن میں سبرید خاں، دونا غازی اور دولت وزیر بہرام خاں خاص طور سے مشہور و ممتاز ہیں۔ مسلمانوں میں بہرام خان کی "لیلیٰ مجنوں" اور دونا غازی کی "سیف الملک" بہت مقبول ہوئیں۔

سولھویں صدی کی نظموں میں "لیلیٰ مجنوں" سنجیدہ انداز بیان اور شاعرانہ خوبیوں کی بنا پر اپنی مثال آپ ہیں۔

اگرچہ "حنیفہ اور کائرا پری" کی کہانی محض فرضی ہے، بلکہ محال، لیکن کیا بلند پروازی میں، اور کیا بیان کی خوبی اور واقعات کے تسلسل کے لحاظ سے، یہ بڑی کامیاب نظم ہے۔ دونا غازی اگرچہ علاول سے پہلے لکھ چکا تھا لیکن اسکی نظم علاول کی نظم سے سادگی اور حسن بیان میں کہیں بہتر ہے۔

ان کہانیوں کی اشاعت کے بعد جو ثقافتی فضا پیدا ہوئی

اس کی بدولت یہ ممکن ہوسکا کہ ھندوانہ قصے کہانیاں بنگالی ادب میں جگہ پا سکیں اور یہ مسلمانوں ھی کی بدولت ممکن ھوا ۔ اس کا ثبوت محمد کبیر کی ''منوھر مدھو مالتی،، مبرید خان کی '' ودیا سندر،، ھیں ۔ اگرچہ '' منوھر مدھو مالتی ،، میں فارسی ادب کے اصنام خیالی، پریاں ، اور یونانی اصنام خیالی کا بہت کچھ ذکر ھے لیکن اس میں تو کوئی کلام ھی نہیں ھو سکتا کہ اصل کہانی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بالکل ھندوانہ ھے۔

نئی تحقیقات سے ایک '' مدھو مالتی کتھا '' کا پتہ بھی چلا ھے ' جو ۱۷۶۹ء میں لکھی گئی تھی ۔ اور اس سے معلوم ھوتا ھے کہ یہ موضوع ھندو ادیبوں کو پہلے سے معلوم تھا ۔ محمد کبیر کی '' مدھو مالتی ،، اسی موضوع کی دوسری کہانیوں سے بہت پہلے لکھی گئی لیکن بعد کی لکھی ھوئی یہ تمام کہانیوں سے اب بھی کہیں اعلیٰ اور بہتر سمجھی جاتی ھے۔

'' ودیا سندر ،، بالکل ھی ھندوانہ موضوع پر ھے۔ مشہور کشمیری اھل قلم، ''ولہن،، نے اپنی '' چوراپنکا شکا '' میں اس کا تذکرہ کیا ھے۔ یہ البتہ ابھی یقین کے ساتھ نہیں

کہا جا سکتا کہ یہ تصنیف میمن سنگھ کے ''کنکا'' ھی کی ھے' جس کے متعلق ایک روایت یہ ھے کہ ''جتنیا'' دنو کا ھمعصر تھا۔

'' ودیا سندر'' کی کہانی میں '' ستیہ پیر'' کی عظمت بیان کی گئی ھے اور اس سے کوئی خاص شاعرانہ لطف نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ فیروز شاہ کے زمانے ۱۵۳۲ء میں شری دھر نے جو '' ودیا سندر'' لکھی تھی اس میں بھی کالی مائی کی عظمت الاپی گئی ھے۔ سبرید خان نے جو '' ودیا سندر'' لکھی ھے اور جس کی زبان متذکرہ بالا دونوں نظموں سے پرانی ھے' شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے سب سے بہتر ھے۔

۲۔ مذھبی شاعری

یہ صحیح ھے کہ قرون وسطیٰ کا بنگالی ادب، موضوع اور مطمح نظر کے لحاظ سے بیشتر مذھبی رنگ کا ھے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے بنگالی ادب ''شیو'' کے پجاریوں اور وشنو کے پرستاروں کی باھمی آویزشوں سے معمور ھے۔

مسلمان علماء کے ذریعے اسلام کی تبلیغ کے بعد جو روشن خیالی اور آزادی' خیالی پھیلی اسکی بدولت ھندوؤں کو

اپنے مذھب کا پاس بہت زیادہ ھوگیا چنانچہ ادب بھی ان جذبات اور ایک نئی مذھبی کشمکش سے متاثر ھوا۔

اس نئے جذبے نےمسلمانوں میں دو قسم کا ادب پیدا کیا:
(۱) ایک تو وہ ادب جسکی ساری بنیاد اسلامی دینیات پر ھے، دوسرے وہ ادب جس میں مسلمان علماء اور پیغمبروں کی عظمت اور ان کے حالات و سوانح کچھ اسی نہج سے پیش کئے گئے ھیں جیسے ھندوؤں نے اپنے دیوتاؤں، دیویوں اور اوتاروں کے متعلق ''وجے کویاں،، لکھی تھیں۔ مسلمانوں کی لکھی ھوئی ''وجے کویاں،، کسی حد تک تاریخی کہی جا سکتی ھیں۔ مگر ان کا بیشتر حصہ صنم پرستانہ ھوتا تھا۔ رستم کی داستان البتہ زیادہ تر، کوئی نہ کوئی تاریخی شخصیت ھوتی تھی۔

اسلامی دینیات پر اب تک ھم کو صرف ایک کتاب دستیاب ھوسکی ھے۔ اور وہ ھے افضل علی کا ''نصیحت نامہ''۔ افضل علی نے ''پداولیاں'' بھی لکھی ھیں۔ افضل علی ایک صوفی تھے اور اس حیثیت سے انکی پیروی علاول نے بھی کی ھے۔ علاول نے بھی ''پد اولیاں'' لکھی ھیں حالانکہ ''تحفہ'' ان کی ایک مشہور کتاب بھی ھے۔ اس سے صاف ظاھر ھوتا ھے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کو اس کا خیال نہ تھا کہ اگر وہ ھندوانہ موضوعات

پر لکھیں گے یا غیر مسلموں کے اصنام خیالی سے کام لیں گے تو وہ کافر یا غیر مسلم کہلائے جائیں گے۔

بنگالی "وجے کویوں" میں هیرو کا ایک منزل سے دوسری منزل تک کوچ کرنا، عموماً اس طرح پیش کیا جاتا تھا کہ اسکا مقصد کسی دیوتا یا دیوی کی عظمت بیان کرنا هوتا تھا۔ "وجے" کے عام معنے بھی هیں فتح، یا کامرانی۔

"وجے" کے معنے "برتری"، "سفر"، یا "ترقی" بھی هوتے هیں۔ بنگله کی وجے کویوں میں یه موخرالذکر معنے زیادہ نمایاں هوتے هیں۔ بنگله کے مسلمان لکھنے والوں نے بھی لفظ وجے اکثر انهی معنوں میں استعمال کیا ھے۔ اسکے ثبوت میں مسلمانوں کی لکھی هوئی نظمیں "رسول وجے"، اور "غازی وجے" پیش کی جاسکتی هیں۔ لیکن مسلمانوں نے هندوؤں کی طرح دیوتاؤں اور دیویوں کی عظمت کے قصیدے نہیں لکھے، کیونکه مسلمان عقیدةً دیوی دیوتاؤں کے وجود کے قائل نہیں۔ دوسرے یه که مسلمانوں کے نزدیک اُن کے صوفیائے کرام اور بزرگان دین کو وهی فوق الفطرت تصرفات حاصل هوتے هیں جو هندو اپنے دیوتاؤں اور دیویوں سے منسوب کرتے هیں۔ اسی لئے مسلمانوں نے اپنی وجے کویوں،

میں ان ھی بزرگان دین کی عظمت اور کارناموں کو اجاگر کیا ھے۔

اس قسم کی نظمیں لکھنے کے لئے مسلمانوں کو وجہ تحریک بھی ایک اور ذریعہ سے ملی۔ مسلمان روایتی طور پر فن تاریخ کے بڑے شیدائی رھے ھیں۔ تاریخ ھند میں بھی اسکی شہادت ملتی ھے۔ چنانچہ دانستہ یا نا دانستہ، مسلمان اھل قلم ایسی نظمیں یعنی وجے کوباں لکھنے میں تواریخی تصورات کو ملحوظ رکھتے رھے۔ یہی سبب ھے کہ مسلمانوں نے ھندوؤں کی لکھی ھوئی غیر تاریخی اور رمزیاتی وجے کویوں کی جگہ تاریخی نظمیں لکھی ھیں۔ مسلمانوں کی لکھی ھوئی وجے کویاں دراصل تاریخی کہانیوں پر مشتمل رھی ھیں۔ پیر اسمعیل غازی کی لکھی ھوئی 'غازی وجے، اسکی بین مثال ھے۔ شیخ فیض اللہ کی مثنوی 'گورکھا وجے' کا مضمون بھی یہی ھے۔ گورکھا ایک تاریخی شخصیت ھے۔ یہ ایک بودھ فقیر تھا۔ اسکی کرامات ھمارے پیروں فقیروں کی کرامات جیسی تھیں اور ان کے بیان کرنے میں شیخ فیض اللہ نے انہیں اس نظم میں تاریخ اور صنمیات کو سمودیا ھے۔ اور جسطرح فردوسی نے ''شاھنامے،، میں مسلمان مشاھیر کے کارنامے بیان کرتے ھوئے

تاریخ اور اصنامیات کو سمو دیا تھا اور خود بہر حال مسلمان کہلایا۔ اسیطرح فیض‌اللہ بھی ایسی وجے کوی لکھنے کے بعد بھی مسلمان ہی رہا ۔

۳۔ مخلوط کلچر کی شاعری

سولھویں اور ستر ھویں صدی کا زمانہ اس حیثیت سے بہت ممتاز ہے کہ اس زمانے میں ہندو کلچر اور مسلم کلچر کو باھم قریب لانے کی بڑی کوشش کی گئی ہے۔ جن حالات میں کبیر (۱۳۱۰ء تا ۱۴۴۰ء) نانک (۱۵۳۹ تا ۱۴۶۹ء) اور چیتنیا (۱۴۸۶ء تا ۱۵۳۳ء) نے شمالی ہندوستان میں جنم لیا ان ہی حالات کا تقاضا تھا کہ (بنگلہ ادب میں) ستیہ پیر یا ستیہ نرائن کی عظمت پر نظمیں لکھی گئیں اور پداولیاں مرتب ہوئیں۔

بہر حال بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر ہندو اور مسلم ثقافت میں ایک مفاھمت پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ

مفاھمت وسیع النظر مسلمان صوفیوں اور ھندو سادھوؤں کی کوششوں سے پیدا ھوسکی۔ اس کے بعد کے ادب میں یہی مفاھمت بلکہ ' دو ثقافتوں کا امتزاج ، رونما ھونا شروع ھوا۔ بنگالی ادب میں یہ امتزاج " ستیہ پیر " نظموں اور " پداولی " گیتوں میں سب سے زیادہ نمایاں ھے۔

" ستیہ پیر " کی کہانیاں بنگالی ادب کا بہت بڑا حصہ ھیں اور ھندو مسلمان دونوں ادیبوں نے اس موضوع پر بیانیہ نظمیں لکھی ھیں۔ ان میں سب سے پہلا شاعر شیخ فیض اللہ تھے۔ انہوں نے اس نظم کے ساتھ لکھا ھے : " منی ویدا راسا شاشی شکودا "۔ جس کا یہ مطلب ھوا کہ انہوں نے یہ نظم ۱۴۶۷ء، ۱۴۹۷ء، ۱۵۴۶ء یا ۱۵۷۵ء میں سے کسی ایک سن میں لکھی۔ یہ ھم سمجھنے سے قاصر ھیں کہ اس عبارت کو ڈاکٹر شوکمار سین نے " منی ویدا راسا شاشی " کی تاریخ میں کیسے بدل دیا اور یہ کیوں کر نتیجہ نکال لیا کہ یہاں ۱۶۴۷ شاکا یا ۱۷۲۵ء مراد ھے۔ غالباً وہ یہ یقین ھی نہیں کرتے کہ کسی مسلمان نے سولھویں صدی عیسوی میں بنگالی زبان میں نظم لکھی ھوگی۔ لیکن ڈاکٹر شوکمار سین نے اعتراف کیا ھے کے انہوں نے شیخ

فیض اللہ کی لکھی ہوی "ستیا پیر" کا قلمی نسخہ دیکھا ھے - اب تک وہ اس نسخے کے وجود سے انکار ھی کرتے رہے تھے -

ان نظموں کا مقصد اپنے سچے روحانی رھنما یا پیر کی عظمت بیان کرنا تھا - ڈاکٹر شوکمار سین نے کہا ھے کہ انھوں نے شیخ فیض اللہ کی اس نظم میں بعض ایسی خاص باتیں پائی ھیں جو اسی کی حدتک مخصوص ھیں - ظاھر ھے اس موضوع پر سب سے پرانی نظم ھونے کے سبب سے اس میں ایک خصوصیت ھونا ھی چاھیئے تھی - ستیا نرائن کی پرستش کا عنصر، جو "سکندا پورن" کے حصے "ریوا" میں ھے ، بعد کا اضافہ ھے - مغربی مورخوں نے تحقیق کے بعد یہ ثابت کردیا کہ اس حصے میں اسلام کے اثرات پائے جاتے ھیں - اصل بات تو یہ ھے کا "ستیا پیر" کا پورا قصہ ھندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبوں کے امتزاج کی پیداوار ھے - اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ھوجائیگا کہ مسلمانوں نے ، اس عقیدے سے متاثر ھوکر کہ "پیر" ھی حقیقت کا رھنما ھے ' ایسی نظمیں لکھنا شروع کیں، اور ھندوؤں نے "پیر" یا روحانی پیشوا کو "ستیا نرائن" بنالیا -

" پداولی " ادب بھی اسی امتزاج کی پیداوار ہے ۔ " فارسی غزل ،، کا رنگ صاف نمایاں ہے ، خصوصاً تراکیب ، تخئیل اور خیال بندی کے لحاظ سے ۔ اس مسئلے پر حصہ سوم کے باب ۲ میں مختصر طور سے بحث کی جا چکی ہے۔

۴ - مرثیئے سولھویں صدی میں بنگالی میں حزنیہ موضوع پر قصے کہانیاں لکھنے کا رواج نہیں تھا لیکن بقول ایک انگریز شاعر کے " ھمارے سب سے میٹھے گیت وھی ھیں جن میں زیادہ سے زیادہ حزن و ملال کے خیالات ھوں ،، ۔ چنانچہ بنگالی ادب کے اس دور میں مسلمان شاعر شیخ فیض اللہ نے " جینبیر چوتیشا ،، (حضرت زینب پرچوتیشا) لکھکر بنگالی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ۔

" چوتیشا " جسے " ۳۴ - حرفی " کہنا چاھئے ، بنگالی نظموں کی ایک بہت قدیم صنف ہے ۔

سنسکرت کی اس نظم میں ، پورے ۳۴ حروف تہجی یکے بعد دیگرے اسطرح استعمال لئے جاتے ھیں کے ھر شعر ان میں سے ایک حرف سے شروع ھو ۔ یہ نظمیں دراصل دیویوں اور دیوتاؤں کی تعریف میں بھجن کی طرح ھوتی ھیں ۔

سنسکرت سے نظم کی یہ صنف بنگالی ادب میں منتقل ہوئی اور یہاں شیخ فیض‌الله نے اسکو ایک نئی شکل میں پیش کیا۔ شیخ فیض‌الله نے "چوتیشا" میں واقعۂ کربلا کے بعد حضرت زینب کا نوحہ نظم کیا ہے۔ اس نوحے کے بعد پھر "ضریح"، گیتوں اور دوسری نظموں، مثلاً "مقتل حسین" کا رواج شروع ہوا۔

۵۔ نجوم پر نظمیں بنگالی مسلمانوں نے بنگالی ادب میں نجوم کے موضوع پر نظمیں لکھنے کی ابتدا کی۔ "سوتنگا" اور "نتی شاسترا ورتا" شاعر مزمل کی نظمیں اسی موضوع پر ھیں۔ اگرچہ اس قسم کی نظموں میں علم نجوم یا فلکیات کے نکات کہیں نہیں ملتے۔ سعد و نحس دن اور ایسی ھی عام دلچسپی کی باتیں درج ہوا کرتی ھیں۔

دوسرے ملکوں کی ایسی کتابوں میں دنوں، واقعات اور فقروں یا لفظوں کی علم نجوم کے لحاظ سے تعبیر کی گئی ھے۔ ان بنگالی نظموں میں بھی کم و بیش اسی کی نقل گئی ھے۔ البتہ مقامی معلومات کا اضافہ پایا جاتا ھے۔

۲۔ موسیقی پر نظمیں

مسلمان فن موسیقی میں مہارت کے لئے مشہور ھیں اورقومی موسیقی کی تدوین و ترتیب میں انھوں نے جو حصہ لیا ھے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ۔ بنگالی ادب میں سولھویں صدی تک موسیقی کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی ۔ اس زمانے میں سب سے پہلے شیخ فیض اللہ نے " راگ نامہ " لکھا ۔ یہ " راگ نامہ " بنگالی زبان میں موسیقی پر سب سے پہلی اور سب سے پرانی کتاب سمجھی جاتی ھے ۔ یہ غالباً سولھویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی اوراس میں راگوں کی مثالیں یا فہرست درج ھے ۔

خلاصہ :۔ متذکرہ بالا بحث سے یہ بات تو صاف ھو گئی کہ مسلمانوں نے ایسا ادب مرتب کرنے میں ھندوؤں کی پیروی یا تقلید نہیں کی ۔ انھوں نے اپنے لئے نیا راستہ بنایا ۔ اس دور کے ھندو ادب میں " بھگوت گیتا " اور "مہابھارت" یا رادھا کرشن اور ایسے ھی دیوی دیوتاؤں کے قصوں کے سوا اور کچھ نہ تھا ۔

مسلمانوں نے بھی مذھبی ادب پیش کیا جس کی بنیاد قرآن پاک، حدیث شریف اور اسلامی تاریخ تھی ۔ اس کے علاوہ

مسلمانوں کی نظموں کے عام موضوع عشق و محبت ، تاریخ، مرثیہ، نجوم یا موسیقی رہے۔

اپنی تصنیفوں اور تاریخوں میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنا اپنا مذہب چھوڑ بیٹھے۔ ہندو، مسلمان ہوگئے یا مسلمان ہندو بن گئے۔ ہندو مسلمان دونوں اتنے عرصے تک ساتھ رہے ہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر ہونا اقتضائے فطرت تھا۔ اس تاثر کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مسلمان، سنسکرت اور ہندو، فارسی پڑھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔

حصہ چہارم

بنگلہ ادب عہد مغلیہ میں

(۱۵۷۵ء سے ۱۷۵۰ء تک)

باب اول

سیاسی پس منظر

بنگال میں مغلیہ حکومت کے ۱۸۰ سالہ قیام کے دوران میں مغل ثقافت کے مخصوص خدو خال نمایاں ہوئے - یا یوں کہئے کہ ایک ثقافتی امتزاج پیدا ہوا - در اصل ہر زمانے کی ادبی تاریخ زیادہ تر اس ثقافتی انقلاب کی تاریخ ہے جو سیاسی انقلاب کے نتیجہ میں رو نما ہوا -

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مغل عہد سے پہلے بنگالی ثقافت کا مرکز، پایہ، تخت گوڑ تھا - مغل فتح کے بعد گوڑ ۱۵۷۵ء میں ایک مہلک وبا کے پھیل جانے سے برباد ہو گیا - تحریری شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ گوڑ کی آبادی اس وقت دس لاکھ بیس ہزار تھی - تقریباً یہ تمام آبادی پلیگ کی نذر ہو گئی - صرف چند لوگ اپنی جانیں بچا کر دوسرے علاقوں میں چلے گئے جن میں بعض اہل علم اور اولیا اللہ بھی تھے - ان کی

اولاد چٹگاؤں میں آج بھی ''گوڑیہ'' کے نام سے مشہور ہے -
اس طرح گوڑ کی ثقافتی حیثیت تو ختم ہوگئی مگر اس واقعہ
نے بنگلہ ادب اور زبان کو بھی بنگال کے دور دراز علاقوں
تک پہونچا دیا -

گوڑ کی تباہی کے بیس سال بعد (۱۵۷۰ء تا ۱۵۹۰ء)
تک گوڑ مغل بنگال کا پایہ تخت رہا - مگر ملک میں بد امنی
کے سبب ثقافتی مرکز نہ بن سکا - افغانوں کی زوال پذیر
طاقت مغل عروج سے برسر پیکار رہی - کبھی افغان فتحیاب
ہوتے اور کبھی مغلوں کو کامیابی ہوتی - غرض کہ امن عامہ
برقرار نہ رہا، تا آنکہ ۷ نومبر ۱۵۹۵ء کو راجہ مان سنگھ
نے بنگال کا پایہ تخت ''گوڑ'' سے ''راج محل''
منتقل کردیا -

اس زمانے میں چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں-
ان میں اہم یہ تھیں : شمالی بنگال میں کوچ بہار - جنوب
مغربی بنگال میں ملا مشرقی بنگال میں ٹپرہ ، شمال مشرقی
سرحد پر کامروپ اور چٹگاؤں میں اراکان - ان ریاستوں
میں درباروں کی طرف سے ادبی مشاغل کی سر پرستی ہوتی
رہی مگر اندورنی اضلاع میں مغل انتظام کے زیر سایہ اس

زمانہ کے ادب مین کوئی خصوصیت نہیں پیدا ہوئی۔ وہی قدیم ویشنو تاریخ، وہی قدیم پداولی ادب، وہی دیوی دیوتاؤں کی شان میں مدحیہ یا دعایہ نظمیں، 'کرشن' رامائن اور مناسا کے قصے اور مذہبی اوصاف کی تعریف وغیرہ۔ یہ اس عہد کے ادب کی خصوصیات تھیں۔ لیکن سرحدی علاقوں میں نہ صرف گوڑ کی روایات قائم رہیں بلکہ جدید راستے بھی نکالے گئے۔ 'تری پورہ' اور 'اراکان' ان سرگرمیوں کے خاص مرکز تھے۔

مغل حکومت کے پہلے پچیس برس میں بے امنی اور بغاوتوں کا بازار گرم رہا۔ 'نوی شنکر مکندرام چکروتی، نے اپنی 'کنڈی منگل'، میں (جس کا زمانہ تصنیف ۱۵۹۴ء اور ۱۶۰۶ء کے درمیان ہے) جنوبی ''راڑھ'' کی بڑی مایوس کن تصویر کھینچی ہے اور یہی اس زمانے میں تقریبا سارے بنگال کا حال تھا۔ اس وقت راجہ مان سنگھ بنگال کا صوبہ دار تھا جہاں کی بدنظمی کا شاعر نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ہر طرف قحط کا دور دورہ تھا۔ اخلاقی حالت پست ترین تھی اور کاشتکار اپنے مویشی اور زمین فروخت کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

مختصر یہ کہ اس زمانہ میں ثقافت کی ترقی کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ ادب کی ترقی مسدود ہوگئی۔ چند معمولی حیثیت کے اہل قلم نمودار ہوئے مگر ان کی تصانیف میں زندگی اور گرمی مفقود رہی اور کوئی قابل ذکر شاعر یا ادیب پیدا نہیں ہوا۔

یہ تصویر بنگالی کے عہد اکبری کے آخری تیس سال (۱۵۷۰ تا ۱۶۰۵) کی ھے اور اگر ھم 'اکبر اعظم' کے علم و فن کی سرپرستی اور اس کے دربار کے مشہور نورتنوں کے کارنامے پیش نظر رکھیں تو اس تصویر پر حیرت ہوتی ھے۔ اس امر کا ثبوت نہیں ملتا کہ اکبر نے بنگلہ ادب سے کسی قسم کی دلچسپی ظاہر کی ہو۔ اکبر کی تعریف میں اس زمانے کی صرف ایک نظم پائی جاتی ھے اور وہ 'ستیا گرام' کے شاعر 'مادھو اچاریہ' کی ھے جس نے اپنی 'چنڈی منگل' کی تمہید میں اکبر کو طاقت و سطوت میں ''ارجن'' اور دانشمندی میں ''بر ھسپتی'' سے تشبیہ دی ھے۔

اس سلسلہ میں یہ جتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شاعر نے اکبر کی دانشمندی اور سطوت وغیرہ کا ذکر تو کیا مگر اس کی علم و فن کی سرپرستی وغیرہ کا کہیں تذکرہ نہیں

کیا ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ شاعر کو بادشاہ سے کوئی فیض نہیں پہونچا تھا ۔

اکبر کے جانشین جہانگیر کے عہد میں (۱۶۰۵ تا ۱۶۲۷ء) صوبہ دار اسلام خاں کے کامیاب انتظام میں صوبہ کی حالت بہتر ہونی شروع ہوئی ۔ اسلام خاں کا سب سے پہلا اور بڑا کارنامہ افغان سرداروں، اراکانی ماگھوں اور ہرمد (پرتگالی)، بحری قزاقوں کی سر کوبی تھی ۔ ان معرکہ آرائیوں کی غرض سے اس نے ۱۶۱۲ء اپنا صدر مقام راج محل سے ڈھاکہ منتقل کر دیا ۔ چند ہی مہینوں میں افغان زیر ہوگئے ۔ قزاق اور ماگھے یا تو قتل کر دئے گئے یا گرفتار ہوگئے اور بنگال سلطنت مغلیہ کا ایک پر امن صوبہ بن گیا ۔

اس زمانہ سے بنگالی کی اپنی ثقافت پر آگرہ اور دہلی سے آنے والے خیالات و تصورات اثر انداز ہونے لگے ۔ اس طرح ایک نئی ثقافت کی روایت قائم ہوئی ۔ جہانگیر نے بائیس سال حکومت کی مگر تعجب ہے کہ بنگلہ ادب میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔

جہانگیر کے بعد ۱۶۲۷ء میں شاہجہان سریر آرائے حکومت ہوا ۔ ثقافتی ترقی کے سلسلہ میں شاہ جہاں کے عہد کو

مغل حکومت کا عہد زریں کہنا چاہئے۔ مغلوں کے زمانے کی جو عمارات ہمیں بنگال میں آج بھی ملتی ہیں اس کے عہد کی یادگار ہیں۔ شاہ جہاں کے دور کی ثقافت کا بنگال پر بڑا اثر پڑا۔ اس کا عہد انتظامی لحاظ سے بھی بہتر تھا۔ ''گداد ھر داس'' نے جو ''بنگلہ مہابھارت'' (۱۶۰۵ء) کے مشہور مصنف ''کاسی رام داس'' کا چھوٹا بھائی تھا اپنی ''جگنا تھہ منگل'' (۱۶۴۵) میں، شاہ جہاں کی بڑی مدح و توصیف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شاہ جہاں نے اپنے پنجاہ سالہ عہد میں بنگال پر عدل و انصاف اور فیاضی کے ساتھ حکومت کی۔ اس کے تمام دشمن زیر ہو چکے تھے اور ساری رعایا خوش وخرم تھی۔

اس موقع پر یہ امر بھی دلچسپی سے دیکھا جائے گا کہ شاعر نے شاہ جہاں کی ایک بادشاہ کی حیثیت سے اضطراری طور پر تعریف کی ہے نہ کہ اپنے ساتھ کسی ذاتی سلوک یا بخشش کی وجہ سے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بادشاہ کی طرف سے بنگلہ ادب کی براہ راست کسی قسم کی ہمت افزائی نہیں ہوئی، مگر اس زمانے میں ملک میں جو عام امن قائم تھا اس کے سبب ثقافتی فضا پروان چڑھی جس سے بنگلہ ادب کو بھی تقویت پہنچی۔

یہ ثقافتی فضا ۱۷۰۷ء تک برابر قائم رہی۔ جس زمانے

میں دلی میں ھنگامہ آرائی ھو رھی تھی اس وقت بھی اراکانی اور ھرمد بنگال کے امن کو برباد نہ کر سکے ۔ شاعر 'کرشن رام داس' شاہ جہاں کے جانشین اورنگ زیب (۱۶۵۷ع تا ۱۷۰۷ع) کی نسبت اپنی 'کالکا منگل' میں کہتا ھے کہ عوام اسے 'رام' سے تشبیہ دیتے تھے ۔

اس موقع پر بھی اورنگ زیب کا ذکر علم و فن کے سرپرست سے زیادہ ایک باوقار شریف النفس بادشاہ کی حیثیت سے کیا جاتا ھے ۔ جب دولت وزیر بہرام خان کی "لیلیٰ مجنوں" اس عہد کے ایک دوسرے معمولی درجے کے شاعر نے دوبارہ لکھی تو اس نے اس میں اورنگ زیب کی مدح میں بھی کچھ شعر داخل کردئے جس میں بادشاہ کی سطوت ، شرافت اور مذھبیت کو خراج تحسین پیش کیا گیا ھے ۔ جس زمانے میں اورنگ زیب کا پوتا "شہزادہ عظیم الشان" ڈھاکہ کا صوبہ دار تھا (۱۶۹۷ع تا ۱۷۱۲ع)، اس وقت مرشد قلی خاں کا بہ حیثیت دیوان بنگال میں تقرر ھوا ۔ وہ ۱۷۰۳ع سے ۱۷۱۷ع تک نائب صوبہ دار بنگال رھا مگر چونکہ شہزادہ سے اختلاف ھوگیا تھا اس لئے اس نے ۱۷۰۴ع میں اس کی دیوانی "مرشد آباد" تبدیل کرادی ۔ "عظیم الشان" نے صوبہ داری چھوڑی تو بنگال کا پایۂ تخت

" مرشد آباد " منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے مرشد آباد بنگلہ ادب کا مرکز بن گیا۔

اورنگ زیب کا بیٹا اور جانشین "شاہ عالم" ایک سنجیدہ، مہذب اور وسیع المشرب شاہزادہ مشہور ہے۔ اگرچہ اس کا عہد مختصر تھا مگر بنگلہ ادب کی تاریخ میں یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ شاہ عالم کے زمانے کے ڈھلے ہوئے سکوں میں ایک پیتل کا سکہ بھی تھا جس کے ایک طرف بنگلہ زبان میں " ایک پائی سکہ " کے الفاظ منقش تھے۔ مغل عہد میں سرکاری طور پر بنگلہ زبان کے اعزاز کی یہی ایک شہادت ملی ہے۔ لیکن بہت سے غیر سرکاری مقاصد کے لئے بنگلہ استعمال ہوتی تھی اور اس میں دستاویزات اور خطوط وغیرہ بھی لکھے جاتے تھے۔

اگرچہ ' مرشد قلی خاں ' بنگال کا دیوان اور نائب صوبہ دار مقرر ہوا تھا مگر عملاً وہ سارے ملک کا صوبہ دار تھا۔ ۱۷۱۷ء کے بعد سے وہ قانونی حیثیت سے بھی صوبہ دار ہوگیا۔ وہ ۱۷۲۷ء تک بنگال کا حکمراں رہا۔ اس وقت بنگال، بہار اور اڑیسہ ایک ہی صوبہ دار کے تحت تھے۔ دہلی میں مغلیہ حکومت آہستہ آہستہ دم توڑ

رھی تھی ۔ صوبہ دار بادشاہ کو صرف سالانہ رقم ادا کرتے تھے ورنہ اپنے اپنے علاقوں میں مطلق العنان حکمرانی کرتے تھے ۔ رفتہ رفتہ انہوں نے صوبہ دار کا خطاب بھی ترک کر دیا اور اپنے کو "نواب" کہلانے لگے ۔ بادشاہ کی بالادستی صرف سکوں سے ظاہر ہوتی ھے ، جن پر ان کا نام کندہ ہوتا تھا ۔ اس طرح مرشد قلی خاں بنگال کا نواب ہوگیا ۔ وہ لاولد فوت ہو گیا تو اس کا داماد شجاع الدین نواب ہوا ۔ شجاع الدین کے بیٹے سرفراز خاں (۱۷۳۹ - ۱۷۴۰ء) کے عہد تک بنگال کے حکمراں نواب ۔ صوبہ دار رھے ۔ جب علی وردی خاں نائب صوبہ دار بہار نے سرفراز خاں کو میدان جنگ میں زک دیکر تہ تیغ کر دیا تو وہ خود بنگال کا نواب بن بیٹھا ۔

اس واقعہ کا ذکر شاعر "بھارت چند" (۱۷۱۲ تا ۱۷۶۰ء) نے اپنی نظم "آنندا منگل" میں کیا ھے ۔ بادشاہ نے فاتح صوبہ دار کو "نواب مہابت جنگ" کے خطاب سے نوازا اور اس کی طرف سے پیش کئے ہوئے قیمتی تحائف قبول کئے مگر کچھ عرصے بعد علی وردی خاں نے شاھی خزانے میں ٹیکس داخل کرنے بند کر دئے اور اپنی خودمختاری

کا اعلان کردیا۔ ۱۷۵۶ع میں اس کا ۸۰ برس کی عمر میں انتقال ہوا تو اس کا نواسہ سراج الدولہ (۱۷۵۶ع تا ۱۷۵۷ع) تخت پر متمکن ہوا۔ سراج الدولہ کو انگریزوں نے "پلاسی" کے میدان میں شکست دی اور بعد میں گرفتار کر کے قتل کرادیا۔ اس طرح بنگال میں انگریزی حکومت کا دور شروع ہوا اور مغل عہد حکومت کا خاتمہ ہوا۔

باب دوم

ثقافتی پس منظر

اس عہد کا ثقافتی پس منظر عہد ماسبق کے ثقافتی پس منظر سے مختلف ہے - یہ کچھ تو قدرتی نشو و نما اور کچھ مغل اثر کا نتیجہ تھا - اس نئی ثقافت میں مغل خصوصیات کا اس قدر زیادہ اثر ہے کہ اس میں اور دھلی و آگرہ کے ثقافتی ماحول میں تمیز کرنا مشکل ہے - تعمیر اور ادب دونوں میں مغل اثر یکساں نمایاں تھا -

ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافت پر مغلوں نے ایک نیا اور مفید اثر ڈالا - اس کی ایک نمایاں خصوصیت وسیع النظری اور کشادہ دلی تھی ' جو معاشرتی اور مذھبی رواداری کی شکل میں ظاھر ھوئی - اپنے بعض عرب ، ترک یا افغان پیشرووٴں کے برخلاف اکبر اور جہانگیر کٹر مذھبی قسم کے حکمراں نہ تھے ، اس کا یہ نتیجہ ھوا کہ بعض لوگوں نے توحید اور دیگر اسلامی اصول کی مختلف تشریح کرنے کی کوشش کی

اور "شیخ احمد سرہندی" جیسے بزرگوں اور مصلحوں نے، نیز خود اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے "فتاویٰ عالمگیری" کے ذریعے ان ملحدانہ رجحانات کا مقابلہ کیا۔ ان مخالف رجحانات کی نمائندہ کتاب دارا شکوہ کی "مجمع البحرین" ہے۔ ان کا اثر مسلمانوں کے بنگلہ ادب پر بھی پڑا۔

مذہبی اور معاشرتی اعتبار سے ایک اہم واقعہ ہندوستان میں اہل شیعہ کی آمد ہے۔ یہ فرقہ ان ایرانی سپاہ کے ساتھ آیا تھا جنھوں نے شہنشاہ ہمایوں کو ہندوستان میں دوبارہ تخت و تاج دلانے میں مدد دی تھی۔ اس کے بعد آج تک شیعہ ہندوستان میں اثر و اقتدار کے مالک رہے ہیں۔ مغل عہد میں یہ برابر بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہے جن میں سے بعض بنگال کے حکمراں بھی تھے۔ بہت سے شیعہ علماء اور تجار بصرہ اور بندر عباس سے، جس کے ساتھ مغرب سے ہماری بڑھتی ہوئی تجارت کے پیش نظر اس زمانہ میں آمدورفت بہت بڑھ گئی تھی، سمندر کے راستے سے بنگال پہونچے۔ اس کے علاوہ ایران میں سیاسی مشکلات کی وجہ سے بھی بہت سے لوگوں کو ترک وطن کرکے بنگال میں پناہ لینی پڑی۔ نواب مرشد قلی خاں اور مابعد

کے نوابوں کے زمانہ میں شیعہ حضرات کا بڑا اثر تھا۔ "مقتول حسین" اور "جنگ نامہ" جیسی رزمیہ اور نیم مذہبی تصانیف اسی اثر کا نتیجہ ہیں۔

مسلم بنگال کی ثقافتی ترکیب میں شمالی ہند کے صوفیا اور اولیا اللہ کی بنگال میں آمد بھی ایک اہم واقعہ ہے۔ اس سے پہلے اکثر صوفیا بنگال میں ہندوستان سے باہر سے آتے تھے۔ مغل عہد میں شمالی ہند کی طرف سے پہلے سے زاید تعداد میں صوفیا آئے۔ بیرون ہند کے صوفیا چودہ مختلف سلسلوں یا روحانی گروہوں سے تعلق رکھتے تھے، اگرچہ ان کے علاوہ بعض متفرق اور غیر منظم گروہ بھی تھے۔ ان میں سے "سہروردی" "چشتی" "قلندری" "مداری" "ادھمی" "نقشبندی" اور "قادری" خاص طور پر مشہور ہیں۔ اور ان میں بھی قلندری مداری اور "ادھمی" سلسلوں کا اثر عوام پر سب سے زیادہ ہے۔

ان گروہوں میں سے چند کے متعلق ذیل کی معلومات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی:-

قلندری اس سلسلہ کے بانی حضرت شیخ شرف الدین بو علی قلندر تھے (متوفی ۱۳۲۴ء)۔ آپ نے

پانی پت میں قیام فرمایا جہاں آپ کا مزار بھی ہے۔ اگرچہ اسلام ترک علائق کی تعلیم نہیں دیتا، چنانچہ ایک عام مسلمان کو گھر بار سے علیحدگی نہ اختیار کرنی چاہئے، مگر حضرت نے ترک دنیا کی تلقین کی۔ آپ کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں دنیا اور دین دونوں نہیں حاصل ہو سکتے اور یہ کوشش لاحاصل اور احمقانہ ہے، خدا کے ساتھ دھوکہ کرنا ہے۔

هم خدا خواهی و هم دنیائے دوں
این خیال است و محال است و جنوں

سولھویں اور سترھویں صدی میں حضرت بو علی کے مریدین نے سارے بنگال میں انہی خیالات کی اشاعت کی۔ ان کی تلقین کی کامیابی اور اثر کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ مغل عہد میں 'صوفی' اور 'قلندر' کے الفاظ عوام میں ہم معنی سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ کوی کنکن مکندا رام، اپنی "چنڈی منگل" (زمانہ ۱۵۹۴ تا ۱۶۰۶) میں صوفیا کے ذکر میں لکھتا ہے کہ ان میں سے "بعض قلندر ہو کر گھومتے پھرتے تھے"۔

مداری اس سلسلے کے مورث اعلیٰ حضرت بدیع الدین "شاہ مدار" تھے۔ آپ کا انتقال ۱۴۳۶ء میں کانپور (اودھ) کے قریب موضع مکن پور میں ہوا۔آپ نے بنگال کا ایک سفر کیا اور مشہور ہے کہ فریدپور میں "مداری پور" اور چٹگاؤں میں "مدار باڑی" اور "مدارسا" نامی گاؤں اسی سفر کی یادگار ہیں۔ آپ کے ایک مرید "شاہ اللہ" نے گوڑ میں "شاہ نو" کے مقام پر آپ کی تعلیمات کی اشاعت کی۔ ۱۶۵۸ء میں سلطان شاہ شجاع کی طرف سے اس سلسلہ کے ایک خلیفہ' شاہ سلطان حسین موریہ برھینہ کو بعض حقوق و رعایات بھی مل گئیں ۔ ان میں سے ایک "مداری مسل" یا مداری سلسلہ کا جلوس نکالنا بھی ہے ۔ شمالی بنگال میں آج بھی ایک سالانہ تیوھار منایا جاتا ہے جسے "مداریربنس" کہتے ہیں اور اس میں مدار کے حلقہ کے لوگ محفل سماع منعقد کرتے ہیں۔

ادھمی حضرت ابراھیم ادھم اس سلسلہ کے بانی اور مشہور زمانہ شخصیت کے مالک تھے۔ متبعین اپنے کو حضرت خضر علیہ السلام کے نسب سے 'خضری' کہتے ہیں۔ عام مسلمانوں کی طرح ان کا بھی عقیدہ ہے کہ خواجہ

خضر تا قیامت روپوش ہوگئے ہیں اور بعض خوش نصیب اشخاص سے ان کی ملاقات ساحل دریا پر ہوجاتی ہے۔ اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ اس سلسلہ کے حضرات بنگال میں کب آئے۔ خضر یا خواجہ خضر بنگال میں خضر پیر مشہور ہوئے۔ دریا کے کنارے واقع شدہ مقامات مثلاً مرشدآباد، ندیا، چوبیس پرگنہ، باریسال، فرید پور، ڈھاکہ، میمن سنگھ، پبنا، چٹگاؤں وغیرہ کے باشندے خواجہ خضر کے وجود پر اعتقاد رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ دریا میں ڈوبتے ہوئے شخص کو بچالیتے ہیں۔ کلکتہ کا 'خدرپور' (خضر پور کی بگڑی ہوئی شکل) اور ڈھاکہ کا 'خضر پور' (جو دریائے لکھشا لیکھیا پر واقع ہے)، خضر پیر کی یاد دلاتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے تک ''بیرا بھاسن'' تیوہار ان کے نام پر منایا جاتا تھا۔ مغل عہد میں یہ تیوہار سرکاری طور پر تسلیم کیا جاتا تھا اور اسے صوبہ دار ڈھاکہ مکرم خاں (۱۶۲۶ - ۱۶۲۷) کی سرپرستی حاصل تھی۔ جب مرشد قلی خاں بنگال کا نواب ہوا، (۱۷۰۴ - ۱۷۲۷)، تو ''بیرا بھاسن'' پھر سرکاری طور پر تیوہار مان لیا گیا۔ ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ صوفیا کے اس سلسلہ کو بنگال میں کس قدر اہمیت حاصل تھی۔

اس عہد میں بنگال میں متعدد صوفیانہ کتابیں منظر شہود پر آئیں۔ ''ستیہ پیر،، یا ''ستیہ نرائن،، جو ھندوؤں کی نظمیں ھیں اور مسلمانوں کی نظم 'جوگ قلندر' میں مذھبی عقائد کے سلسلہ میں کافی وسیع النظری سے کام لیا گیا ھے۔ اگرچہ ان نظموں کی ادبی حیثیت معمولی ھے مگر ان کی تاریخی اھمیت ضرور ھے۔

مغل عہد میں بنگال میں فارسی زبان کو بڑا عروج حاصل ھوا۔ اگرچہ مغلوں سے پہلے بھی فارسی دربار کی زبان تھی لیکن رسوم و تقریبات وغیرہ کے مواقع پر عربی استعمال ھوتی تھی۔ بعض مؤرخین کا بیان ھے کہ فارسی زبان سکہ جات یا کتبات کے سلسلہ میں کبھی استعمال نہیں ھوئی۔ عربی اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی زبان تھی، فارسی دربار کی زبان تھی اور روزمرہ کی بول چال بنگلہ میں ھوتی تھی۔ اس کے برعکس ھندوؤں کو سنسکرت سے زیادہ لگاؤ تھا۔ اس کے باوجود مسلمان اور ھندو دونوں بنگلہ زبان بولتے تھے۔ یہاں اس امر کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہوگا کہ ھمیں عیسیٰ خاں کی ایک توپ پر جو اس کے پاس شاید اکبر سے بغاوت کے زمانہ میں تھی، بنگلہ کے یہ الفاظ کندہ ملے ھیں:

" سرکار شری جت عیسیٰ خان "

مسند عدلی سن ھجری ۱۰۰۲ — مطابق ۱۰۹۵ "

بہر حال مغل عہد میں نہ صرف دربار میں بلکہ معاشرہ کے ہر حصہ میں فارسی زبان کا سکہ رواں تھا ۔ مغل عہد کے بعد سے شاید ھی کوئی کتبہ عربی زبان میں لکھا گیا ھو ۔ فارسی متمدن طبقہ کی زبان تھی ۔ مسجدوں میں اور سکہ جات پر اسی زبان میں عبارتیں درج ھوتی تھیں ۔ یہی دربار میں بولی جاتی تھی ۔ مال گزاری وغیرہ کے کاغذات اسی میں مرتب ھوتے تھے ۔ کسی شخص کے معاشرتی اور تعلیمی معیار کی کسوٹی اس کی فارسی دانی ھی متصور ھوتی تھی۔ سرکاری ملازمت کیلئے فارسی زبان بہترین سفارش تھی ۔ اس لئے ھندو اور مسلمان بلکہ سبھی اقوام فارسی تعلیم پر وقت اور محنت صرف کرتی تھیں ۔ قدرتی امر تھا کہ ان حالات میں اس زمانے کے مسلمانوں کا بنگلہ ادب فارسی زبان و ادب سے متاثر ھو ۔ چنانچہ مسلمان شاعر علاول (۱۶۰۷ء تا ۱۶۸۰ء) اور ھندو شاعر بھارت چندر (۱۷۱۲ - ۱۷۶۰) کی سیاسی شاعری پر فارسی اثر برابر نمایاں ھے ۔

ھندو معاشرہ کی حالت کے ذکر کے سلسلے میں یہ بیان کرنا ضروری معلوم ھوتا ھے کہ اس عہد میں " گوڑ " کے

ویشنومت کو ایک نئی زندگی ملی - ۱۵۳۳ء میں ''چیتنیا،،
کی وفات کے تقریباً نصف صدی بعد تک عملی اعتبار سے ویشنومت
کا زور رہا -، چیتنیا' نیتا نندا اور ادوتیا اس تحریک کے
علمبرداروں میں سے تھے- اس کے نصف صدی بعد شری نواس
(۱۵۲۲—۱۶۰۸)، نروتم (۱۵۳۱—۱۶۱۱) اور 'شیام آنند'
(۱۵۳۵—۱۶۳۰) نے اس تحریک کو نئی زندگی و تقویت بخشی-
قابل ذکر ویشنوی ادب میں، بھگتی رتنا کر، پریم ولاس، نروتم
ولاس اور '' انوراگ ولی'' شامل ھیں - بنگال کے عوام میں وشنو
مبلغین کا بڑا اثر تھا - اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ بنگلہ لوک
گیتوں مثلاً بھٹیالی، باؤل گیت، مرشدی اور گمبھیرا گیتوں میں
کیرتن کا رنگ آگیا، ان گیتوں میں 'رادھا' اور 'کانو' کا تذکرہ
ھوتا تھا - اواخر سولھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک
ھمیں جنن داس ، گووند داس ، بلرام داس ، نروتم داس ،
کوی شیکھر اور کوی رنجن جیسے شعرا کے
دوھے، ویشنوی پد اور گیت بکثرت ملتے ھیں -
کیرتن جو رینیتی ، گدان ھتی ، منوھرسین اور اسی قسم
کی دوسری دھنوں میں لکھے اور گائے جاتے ھیں بہت مقبول
تھے - انہیں مرتب اور محفوظ کرلیا گیا ھے - ان میں سے
بعض مجموعے جو اٹھارویں صدی کی ابتدا میں مرتب کئے گئے

تھے یہ ہیں : رادھا موھن ٹھاکر کی "پدم امرت سمدرا"، ویشنو داس کی "پدا کلاپترو" اور گور سندر دیو کی "سنکیرتن آنندا"، — بشوا ناتھ داس کی "گیتا چنتامنی"، جو بنگال کے پدوں کا سب سے پہلا مجموعہ ہے اس میں تقریباً پینتالیس شعرا کے پد شامل ہیں۔ اس کا زمانۂ ترتیب سترھویں صدی کا آخری چوتھائی حصہ ہے۔ چند مجموعے مسلمان شعرا نے بھی مرتب کئے ان میں فاضل ناصر محمد کی "راگ مالا"، سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کام پر اسے سلطان پور، چٹگاؤں کے زمیندار وحید محمد نے ۱۰۸۹ ماگھی یا ۱۷۲۷ء میں مامور کیا تھا۔ اس کے مجموعے میں بعض مسلمان شعرا کے پد بھی شامل ہیں۔

اس عہد کا ایک اور اہم واقعہ پرتگالیوں کی آمد ہے۔ ان کا پہلا ملاح "ڈوم جو آو ڈا سلویرا" ۱۵۱۸ء میں چٹگاؤں پہونچا۔ سلطان محمد شاہ کے عہد حکومت (۱۵۳۳ - ۱۵۳۸) میں کچھ پرتگالی پیام بر گوڑ بھیجے گئے مگر سلطان نے ان کے اسناد قبول نہیں کئے۔ ۳۰ اپریل ۱۵۵۹ء کو انہوں نے راجہ پرمانند رے، والیٔ باقر گنج (بکل راج) سے معاہدہ کرلیا جس کی روسے انہیں تجارت کی اجازت مل گئی۔ بعد میں سترھویں صدی میں بکلا (باریسال)، سندیکن یا چندیکن

(جیسور) ، شری پور (ڈھاکہ) ، بھلوا (نواکھالی) ، کٹرا بھو (میمن سنگھ ڈھاکہ) اور بعض دیگر مقامات کے ''بھوئیاں،، (زمیندار) اُن کی حوصلہ افزائی کرتے رہے جس سے اس ملک میں اُن کے قدم اور مضبوط ہو گئے۔ پرتگالیوں نے تملوک، ھجلی، ھوگلی (''بورٹو پیکوئینو،،) ڈھاکہ، چٹگاؤں (''پورٹو گرانڈے،،) وغیرہ میں اپنی ''کوٹھیاں،، قایم کرلیں جو ان کے تجارتی مرکز تھے۔ اس طرح بنگال میں آھستہ آھستہ اھل پرتگال کا اثر قائم ھو گیا۔

ابتدائی زمانے میں جو پرتگالی بحری قزاق آئے انھوں نے ھم لوگوں کو بڑی مشکلات میں مبتلا کیا۔ یہ سب کو معلوم ھے کہ ''ھرمد'' کا لفظ جو دراصل ''آرمیڈا،، (بحری بیڑہ) کی بدلی ھوئی شکل ھے' اسی زمانے کی یادگار ھے۔ سترھویں صدی کے ادب میں پرتگیزوں کا تذکرہ دو مقامات پر آتا ھے۔ مکندا رام کوی کنکن نے اُن کے مظالم کا حال 'کنڈی منگل ، (زمانہ تالیف ۱۵۹۳ - ۱۶۰۶) میں لکھا ھے اور علاول نے ''پدماوتی،،(تالیف ۱۶۵۱) میں اُن کی سفاکی کی داستان بیان کی ھے۔

پھر بھی یہ کہنا کہ پرتگالیوں نے اس ملک میں صرف لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ ھی کی ، غلط ھوگا۔ واقعہ

یہ ہے کہ وہ بہت جلد ہماری سیاسی، مذہبی اور ثقافتی زندگی میں دخیل ہو گئے اور ان کا اثر دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ ہمارے سپاہی نیز زمیندار بھی ان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ مساجد کے ساتھ ساتھ پرتگیزی گرجا بھی قائم ہونے لگے۔ دیگر یوروپی اقوام کے برخلاف وہ ملکی لوگوں سے الگ تھلگ نہ رہتے تھے بلکہ ان سے آزادی سے ملتے جلتے بلکہ شادیاں تک کرنے لگے تھے۔ اس طرح ایک نئی جماعت یورپ اور ایشیائی نسل کی وجود میں آئی جو ,,تانشں فرنگی،، یا ,, بھورے عیسائی،، کہلائی۔

ایک اور بات قابل لحاظ یہ ہے کہ پرتگالیوں نے پہلے پہل بنگلہ میں نثری ادب پیدا کیا ورنہ اس سے پہلے بنگلہ میں صرف نظم پائی جاتی تھی۔ انہوں نے نثر کی ابتدا عیسائی مذہب کی تبلیغ کے سلسلہ میں کی۔ ,,فادر سوسا،، نے ۱۵۹۹ع میں ایک عیسائی تبلیغی کتاب کا بنگلہ میں ترجمہ کیا جو اب نایاب ہے۔ لیکن ایک بنگلہ کتاب ,,برہمن - رومن کیتھولک سنگباد،، موجود ہے۔ اس کا مصنف ایک ہندو تھا جس کو پرتگالیوں نے ۱۶۶۳ع میں عیسائی بنایا اور عیسائی نام ,, ڈوم انٹونیو ڈا روزیریو ،، رکھا۔ پرتگالی مبلغ ,, منوئل ڈا آسوم پاکاؤ،، نے اس کتاب کو رومن حروف میں لکھا۔

اس نے '' بنگلہ نثر میں ایک اور تبلیغی کتاب لکھی جس کا نام کرپپار شاستریر اورتھو بھید '' ہے اور پہلی بنگلہ گرامر اور بنگلہ لغت بھی مرتب کی ۔ یہ دونوں کتابیں لزبن میں ۱۷۴۳ع میں طبع ہوئیں ۔

چنانچہ بنگالی ثقافت پر پرتگالی اثر بھی کافی پڑا ۔ پرتگالیوں نے سب سے پہلے تمباکو کی کاشت کی (ٹوباکو : پرتگالی ۔ ''تماک'' بنگلہ) ۔ انہوں نے آلو (''پتاتا'') کی کاشت کی بھی ابتدا کی ۔ یہ ہر دو اشیا وہ جنوبی امریکہ سے اپنے ساتھ لائے تھے ۔ اسی طرح وہ کاجو (''آکاجوبا'') برازیل سے اور پپتیا (''پپایا'') ۔ اناناس (پائن ایپل) ''کارمبولا'' (بنگلہ ''کام رنگا'') امرود (گونیاوا) نیز بعض دیگر میوے بھی دنیا کے دوسرے ممالک سے لائے ۔ بر آمدہ (وراندا) جنگلا (ونڈو) چابی (کیز) بالٹی (بلاڈا) پیپا (فیور) تولیا (تولیا) آلپن (الفی نیٹ) صابن (''سباؤ'') کے الفاظ پرتگالی زبان کا تحفہ ہیں ۔

اس دور کے ادب کا ان تاریخی حالات اور ثقافت پر ان کے اثرات کا تذکرہ کئے بغیر نامکمل ہوگا ۔

تیسرا باب

عہد مغلیہ کے شعراء

تمہید

ھمارے قدیم ادب کا بیشتر حصہ ھنوز دستیاب نہیں ھوا اور ھمارے ادیبوں اور نقادوں کی توجہ کا منتظر ھے ۔ تاھم ھمارے کچھ ادیبوں کی مساعیٔ جمیلہ کے طفیل ، جن میں مولوی عبدالکریم مرحوم کا نام خاص طور پر قابل ذکر ھے ، بنگال کے مسلمان اھل قلم کے مخطوطات کا ایک گراں بہا ذخیرہ منظر عام پر آچکا ھے ۔ ان دستاویزوں سے ایسے شعرا کی ایک بڑی تعداد اور ان کی تصانیف کی مقدار کا پتہ چلتا ھے جو عہد مغلیہ میں داد سخن دے رھے تھے ۔ ھم نے اس مواد سے بہت کچھ استفادہ کیا ھے ۔ مولوی علی احمد صاحب کی " فہرست مخطوطات بنگالی " اور مسلمان ویشنو شعرا پر پروفیسر جتندر موھن بھٹاچاریہ کا مقالہ بھی اس سلسلہ میں کافی اھم ھیں ۔

اس مختصر کتاب میں عہد مغلیہ کے تمام شعرا کی تصانیف پر تفصیل سے بحث کرنا بہت دشوار ہے۔ اس لئے ہم صرف خاص خاص اہل قلم کے ذکر پر ہی اکتفا کریں گے۔ ہر چند کہ ہماری یہ کوشش سیر حاصل کہلانے کی مستحق تو نہیں ہے لیکن ہم عام ادبی ماحول کی تصویر اس طرح پیش کریں گے کہ عہد بعہد ترقی کا اندازہ لگایا جا سکے ۔ اور ہمیں امید ہے کہ یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب سمجھی جائیگی ۔

اٹھارویں صدی کا شاعر ،مقیم، جو چاٹگام کے گاؤں نوا پاڑہ کا رہنے والا تھا اتفاقیہ طور پر اس دور کی ادبی تاریخ مرتب کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوا ہے ۔ اس کی کتاب ،فیض المقتدی، جسے اس کا آخری کارنامہ بتایا جاتا ہے - ۱۷۷۳ء کی تصنیف ہے - وہ ۱۷۰۰ء سے ۱۷۸۰ء تک زندہ رہا ۔ اس نے چاٹگام کے بہت سے قدیم اور اپنے ہمعصر شعرا کا ذکر کیا ہے ۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب چاٹگام میں انگریزوں کے تسلط کے زمانہ یعنی ۱۷۶۰ء میں تصنیف ہوئی جبکہ انہیں میر قاسم نے سند عطا کی تھی ۔ ''گل بکاؤلی،، غالباً ۱۷۶۰ء اور ۱۷۷۰ء کے درمیانی زمانہ میں لکھی گئی ۔

سید سلطان ، محمد خان ، دولت قاضی ، علاول ، عبدالنبی ، "غیاسک" (غیاث خان) ، مزمل ، معبود رضا، شیخ پران، پراگل ، فاضل ناصر ، طاهر ، علی محمد اور کانو ، کو ،مقیم، اپنا پیشرو بتاتا ھے اور شاہ علی رضا ، ھری ، علی میاں ، محمد مقیم، اور شری یت رانش قاضی کو بھی اپنا ھمعصر بتاتا ھے - چانکہ کے اکثر شعرا کے زمانہ کا اندازہ لگانے کے سلسلہ میں یہ فہرست بڑی کارآمد ثابت ھوئی ھے -

ھم نے آئندہ صفحات میں شعرا کو صحیح تاریخی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ھے کیونکہ ادب کے ارتقائی عمل کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ھے اور اس کتاب کا اصل منشا بھی یہی ھے - ھم نے جو سنین پیش کئے ھیں ان پر ھمیں خود بھی قطعی اعتماد نہیں ھے لیکن ھمیں امید ھے کہ ھماری یہ چھان بین آئندہ تحقیق کے لئے چراغ راہ ثابت ھوگی-

سید سلطان : سید سلطان بنگال کے قدیم ترین شعرا (؟ ۱۵۵۰ء تا ؟۱۶۴۸ء) میں سے ھیں - انہوں نے اپنی نظم "شب معراج" میں اپنی زندگی کے کچھ حالات بیان کئے ھیں-

سید کے سلسلہ میں ہمارے پاس بس یہی ایک دستاویز ہے
جس سے ہم ان کے عہد کا تعین کرسکتے ہیں اس کے ایک اشارتی فقرہ
یعنی ''گراھا شاتا راشا جوگے'' کی تشریح کرنا ایک نازک
مسئلہ ہے جسے صرف ڈاکٹر شہیداللہ نے قابل قبول حد تک
حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے ہی
سید سلطان اور محمد خاں کی استادی شاگردی کے تعلق کی
طرف توجہ دلائی۔ اس کے علاوہ چند قدیم اور معاصر
مخطوطات کا موازنہ کرنے کے بعد انہوں نے اس بات کو ثابت
کیا ہے کہ '' جوگے '' اصل میں '' جگ '' ۔ تھا اور
اس طرح بعض دوسرے امور پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے تاریخوں
کا تعین کیا ہے ۔ چنانچہ وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں
کہ شاعر نے '' شب معراج '' '' گراھا شاتا راشا جوگے ''
(لغوی : بے شمار ستاروں کے اثرات) تصنیف کی تھی ، جس کی
تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے :

گراھا شاتا = ۹۰۰

راشا = : ۹ (اس سے نو بھی مراد لئے جا سکتے ہیں اور
چھ بھی۔ لیکن ۹ زیادہ صحیح ہے)

جوگ ۴ = ــــــــــــــــــــــــــــــــ

۹۹۴ ھجری = ۱۵۸۸ یا ۱۵۸۶ عیسوی

پس " شب معراج " کا سنہ تصنیف ۱۵۸۶ء قرار پاتا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ سید سلطان کی عمر اس وقت ۳۵ سال تھی تو وہ تقریباً ۱۵۵۰ء میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ انہوں نے بڑی عمر پائی ورنہ وہ اتنی بہت سی تصانیف یادگار نہ چھوڑ سکتے۔ مزید براں ان کے جانشینوں اور ان جانشینوں کے شاگردوں کے حالات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سید سلطان نے ۱۶۴۸ء کے لگ بھگ وفات پائی گویا ان کی عمر ۹۸ سال کی تھی، جو بڑی حد تک قرین قیاس ہے۔ اس تخمینے کی تائید بعض دوسرے واقعات سے بھی ہوتی ہے جن پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔

سید سلطان کے شاگرد محمد خاں نے اپنے استاد کے حسب الحکم " قیامت نامہ " تصنیف کیا تھا۔ ان کی سب سے پہلی کتاب " ستیا کی وواد سنگباد " (جنگ نامہ عہد حاضر) کا سنہ تصنیف "دس ستوبان ستوبان دسو ددھی" یعنی ۱۵۵۷ شاکوادا یا ۱۶۳۵ء ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس وقت محمد خاں کی عمر ۳۵ سال کی تھی ان کی تاریخ پیدائش ۱۶۰۰ء ہوتی ہے۔ جب کہ

سید سلطان کی عمر ۵۰ سال کی تھی - محمد خاں نے "قیامت نامہ" ۱۶۴۶ ء میں لکھا تھا - ان کا بیان ہے کہ "نبی بنگشا" ("خانوادۂ نبی") ایک مشہور شخصیت نے تصنیف کی تھی لیکن وہ کسی وجہ سے اس کی تکمیل نہ کر سکے اور انہیں (محمد خاں کو) حکم دیا گیا کہ "رسولر اوفات" (وفات رسول) کا بیان لکھ کر اسے مکمل کریں۔

"پیر شاہ سلطان استادوں میں سب سے زیادہ مہربان ہیں
وہ اپنے شاگردوں سے محبت کرتے ہیں - وہ نیکیوں کے
موتیوں کا بڑا گنجینہ ہیں،
ان کے حکم کا سہرا اپنے سر پر باندھتے ہوئے'
محمد خاں "پنچالی" ("مقتول حسین") میں گفتگو کرتا ہے"

۱۶۴۶ء میں سید سلطان کا انتقال ہوگیا جس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی تصنیف مکمل نہیں کرسکے اور انہوں نے محمد خاں سے اس کو پورا کرنے کی فرمائش کی - چنانچہ محمد خاں کہتے ہیں :—

"وفات رسول پر وہ اپنی تصنیف کا اهتمام نہ کرسکے'
اور آخرکار مجھے ایسا کرنے کے لئے کہا'
ان کے حکم کی تعمیل میں

میں نے چار اصحاب کے متعلق یہ (پداولیاں) لکھی ہیں ،
اور دو بہادر بھائیوں کا قصہ بیان کرنے کے بعد
قیامت کی نشانیوں اور پیش آنے والے واقعات کو
نقل کیا ہے ،

سب سے آخر میں دیدار الٰہی کا ذکر کرتا ہوں ،
اب لکھنے کے لئے کچھ اور باقی نہیں۔
اگر دونوں '' پنچ لیکھائیں'' (''خمسہ'') برابر برابر رکھ
دی جائیں ،

تو آغاز اور انجام ایک دوسرے مل جائیں گے۔
('' قیامت نامہ '')

پس اگر سید سلطان کا انتقال '' قیامت نامہ '' کی تصنیف
کے دو سال بعد ہوا ہو تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ
۱۵۵۰ء سے ۱۶۴۸ء تک زندہ رہے۔

اس شاعر کے مولد کے متعلق بھی اختلاف رائے پایا
جاتا ہے ۔ حالیہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ
وہ چاٹگام کے پرگنہ چکراشالا میں پیدا ہوئے تھے۔
ان کے جانشین' مقیم' کا بیان ہے کہ وہ چکرا شالا کے میر خاندان
کے چشم و چراغ تھے اور خود بھی ایک پیر تھے۔

مظفر بھی، جنہوں نے 'مقتول حسین' میں ''حنیفو بترا باٹھی''
کے بارے میں ایک ٹکڑا لکھا ہے اپنے آپ کو سید سلطان کا
پوتا اور چکرا شالا کا باشندہ بتاتے ہیں۔ اس میں شبہ کی
بہت کم گنجائش ہے کہ سید سلطان چاٹگام کے نوانی بیٹیا
کے رہنے والے تھے۔ خود سید سلطان نے اپنے گاؤں کا نام
'لسکر پور' بتایا ہے۔ جس کے معنی لشکر کا قصبہ یا اصل میں لسکر
پراگل خاں کا قصبہ ہیں یا دوسرے لفظوں میں فی الحقیقت '' پراگل
پور''۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید سلطان نے اپنے مریدوں سے
ملنے کے لئے عارضی طور پر وہاں قیام کیا ہوگا اور اسی جگہ
''شب معراج'' تصنیف کی ہوگی۔ انہوں نے '' آچی '' کا لفظ
استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں '' میں ٹہرا ہوا ہوں ''۔
وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ اُن کا اصلی وطن تھا۔

ہم یہ صحیح طور پر نہیں بتاسکتے کہ انہوں نے کتنا
کچھ لکھا۔ البتہ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصانیف میں
شامل ہیں:—

۱—نبی بنگشا

۲—شب معراج

۳ — رسول وجے

۴ — ''اوفات'' رسول

۵ — ''جیکم'' راجر لڑائی

۶ — ابلیس نامہ

۷ — جنن چوتیشا

۸ — جنن پرادیپ

۹ — معرفتی گان

۱۰ — پداولی

اب ہم ذیل میں ان کتابوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں :—

۱ — 'نبی بنگشا': اس کتاب کو سید سلطان کا ادبی شاہکار کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ضخامت، وسعت اور تنوع میں 'راماین' بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بنگلہ زبان میں رزمیہ نظم کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ بظاہر اس میں اسلام کی ایک ہندی تصویر پیش کی گئی ہے، مثلاً پیغمبر کے لئے "اوتار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت سید سلطان "اوتار" کو مجسم وجود خداوندی یعنی خدا کے انسانی شکل میں ظاہر ہونے کے معنی میں [illegible] کی

کسی صورت میں بھی حمایت نہیں کرتے - بلکہ اس کے
برخلاف شاعر اس نظم میں عقیدۂ توحید کی تلقین کرتا ہے۔
انہوں نے ایک عام ہندی لفظ "اوتار" کو شاعرانہ انداز میں
استعمال کیا ہے - جس کا مقصد ایک ایسی زبان میں جسے
وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کفار کی نظروں میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو دکھلانا ہے - اس طرح
"برہما" "وشنو" "مہیشور" اور عیسیٰ "رام" "ارجن"
کو بھی اوتار کہا ہے - جنہیں خدا کی طرف سے "تمام وید"
"مجید" "رگ وید" اور "اتھروید" وغیرہ آسمانی صحائف
عطا ہوئے تھے اور چونکہ "شروتی" یعنی الہام و وحی
کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا یہ تمام وید فرسودہ قرار
دئے گئے تھے - اس کے بعد حضرت آدم ؑ، شیث ؑ،
ادریس ؑ، نوح ؑ، ابراہیم ؑ، موسیٰ ؑ، داؤد ؑ، سلیمان ؑ
عیسیٰ ؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید
کی تعلیم دینے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا - شاعر کے خیال
کے مطابق تمام ویدوں میں حضرت محمد الرسول اللہ صلعم کے
وجود مسعود کی پیشین گوئی کی گئی تھی - عام مسلمانوں کا
عقیدہ ہے کہ توریت، زبور، انجیل اور دوسری تمام الہامی

کتابیں جن میں تحریف کردی گئی تھی قرآن نازل ہونے کے بعد منسوخ ہوگئی تھیں - شاعر نے ہندو شاستروں کے متعلق بھی اسی قسم کی رائے ظاہر کی ہے -

'' نبی بنگشا '' کے متعلق مذہبی نقطۂ نظر سے خواہ کچھ بھی کہا جائے، یہ امر مسلم ہے کہ یہ کتاب خاص طور پر توحید کی اشاعت کی غرض سے لکھی گئی تھی - چنانچہ شاعر کے الفاظ ہیں :

اے مرد و زن سید سلطان کی بات سنو
اس کی ہندی '' نبی بنگشا '' کی طرف متوجہ ہو
جو عربی میں تھی لیکن اس نے تمہارے استفادے کیلئے
اسے ہندی کا جامہ پہنادیا ہے
اور اسے ایسے اسلوب میں بیان کیا ہے جسے اہل بنگال
بہ‌آسانی سمجھ سکیں
جو کم علمی کے باعث ' مقدس عربی زبان کو
نہیں سمجھتے
اور ایک ہندو زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے باعث
ہندو رسوم سیکھ جاتے ہیں

(نبی بنگشا)

اس کتاب کا موضوع اس قدر وسیع ہے کہ یہاں اس پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں۔تخلیق کائنات کے متعلق ایک خیالی بیان سے یہ کتاب شروع ہوتی ہے اور حضرت رسول مقبول صلعم کی ولادت کے بیان پر ختم ہوتی ہے۔ برھما ، وشنو ، مہیشور ، نرسنھا ، بامن ، رام ، کرشن آدم ، شیث ، نوح ، ابراھیم ، موسیٰ ، عیسیٰ اور دوسرے انبیا کے قصص بھی موقع بموقع درمیان میں بیان کئے ہیں۔ یہ ''قصص الانبیا،، کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اسی قسم کی ایک شاعرانہ تصنیف ہے۔ ''شب معراج،، میں اس نظم کے مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے :-

اچھی طرح سمجھ لو کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں

میں نے اسلام کی اشاعت کی ہے

اور تینوں جہان کی تخیق کا حال بیان کیا ہے

ملائک کا اور شیاطین کا

آدم کا اور حوا کا

اور بعثت رسول کا

بنگال میں یہ باتیں کوئی نہ جانتا تھا

انھوں نے یہ باتیں " پنچالی " اور "نبی بنگشا " سے سیکھیں"۔

("شب معراج")

"نبی بنگشا" کے نفس مضمون کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا آسان کام نہ تھا ۔ شاعر کے لئے یہ بڑا دشوار گزار مرحلہ تھا ۔ اس کے باوجود یہ نظم قرون وسطیٰ کی بنگالی شاعری کا ایک نفیس نمونہ ہے جس میں فکر کی گہرائی اور لطافت ہے ، تخیل کی بلند پروازی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بحر بھی بے حد موثر ہے ۔ آدم اور حوا کے جدا ہونے کے بیان کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ حصہ "باراماشی" کی طرز پر ہے ، جو نوحہ خوانی کا ایک طریقہ ہے۔

اس صنف میں سال کا ہر مہینہ پوری شان و شوکت کے ساتھ باری باری پیش کیا گیا ہے اور پس منظر کے تضاد سے حسن غمردہ کی حالت کو اور زیادہ حسرت انگیز بنا دیا گیا ہے۔ بندش اور طرز بیان بھی نہایت پر استعارہ ہے۔

(ب) "شب معراج" : یہ نظم خاص اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اس کے ایک بند میں ، جو اوپر نقل کیا گیا ہے شاعر نے اپنے ذاتی حالات پر روشنی ڈالی ہے ، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس

کا سنہ تصنیف ۹۹۴ ہجری مطابق ۸۶-۱۵۸۵ عیسوی ہے۔ اس میں شاعر نے ایک مذہبی موضوع کو بنگلہ زبان میں بیان کرنے پر اظہار معذرت کیا ہے جس سے اس زمانہ کے قدامت پسندانہ نظریہ پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ بھی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کا نفس مضمون رسول پاک کی روحانی معراج ہے۔ اس میں جنت اور دوزخ کا وہ نقشہ ہے جیسا کہ رسول پاک نے دیکھا تھا۔ ملائکہ اور انبیا کا ذکر اور گفتگو ہے جن سے رسول کریم نے ملاقات فرمائی تھی۔ اور اس قسم کی بہت سی خیالی تفصیلات ہیں جن کی بنیاد پر نظم آگے بڑھتی ہے اور بیان میں ایک قسم کا تنوع پیدا ہوتا ہے۔ شاعر نے اس سلسلہ میں حضور صلعم کی ولادت اور ان کی زندگی کے دوسرے واقعات بھی بیان کئے ہیں۔ معراج کی شب میں حضرت جبرئیل علیہ السلام براق لے کر رسول مقبول کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں جو حضور پر نور کو بارگاہ خداوندی میں پہنچاتا ہے۔ حضور انور حضرت جبرئیل کو شناخت نہیں کرتے تو فرشتہ بڑے پروقار انداز سے اپنا تعارف اس طرح کراتا ہے :-

اگر میں ابراہیم کی اعانت نہ کرتا

تو وہ آگ میں جل جاتے
جب فرعون نے موسیٰ کا تعاقب کیا
کہ انہیں دریا میں ڈبودے ۔
اگر میں ان کے ساتھ نہ ہوتا
تو وہ دریا کو عبور نہ کرسکتے
میں عیسیٰ کے ساتھ تھا
جب یہودیوں نے انہیں صلیب پر چڑھایا
وہ میں ہی تھا جس نے انہیں یہودیوں کی نظروں سے پوشیدہ کردیا
میں نے ان کی اسطرح نظربندی کی کہ انہوں نے (عیسیٰ کے بجائے) ایک یہودی کو قتل کردیا
ایک نبی بھی ایسا نہیں گزرا
جسے میری اعانت کی ضرورت نہ ہوئی ہو
حضرت، میں ہوں جبرئیل !
خدا کی طرف سے اس کے حکم کے مطابق حاضر ہوا ہوں ..

حضرت پیغمبر صلعم، جبریل کے ساتھ آسمان پر تشریف لے گئے، جنت اور دوذخ سے گزرے۔ بہشتی حوروں کا بیان کرتے وقت شاعر افسانوی دنیا میں پہونچ جاتا ہے اور بڑے ذوق و شوق سے انسانی حسن کی تصویر کشی کرتا ہے۔

(ج)۔ ''رسول وجے'': بہ نظم ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی سید سلطان کی دوسری تصانیف مثلاً 'نبی بنگشا' اور 'شب معراج' کی فہرست شامل ہے۔ اس نظم میں مغازیٔ رسول کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مقابلہ ایک اسی قسم کی تصنیف سے دیا جاتا ہے جو ضیاءالدین کے قلم کی مرہون منت ہے۔

(د)۔ ''وفات رسول'': سید سلطان کی دوسری تصانیف کے مقابلہ میں یہ بہت مختصر کتاب ہے جو بمشکل ۲۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ مولوی عبدالکریم کی رائے میں یہ ''نبی بنگشا،، کا ایک جزو ہے لیکن علیحدہ طور پر یہ ایک مکمل تصنیف ہے۔ البتہ اس بڑے منصوبہ کا ایک جزو ضرور ہے جو سید سلطان کے پیش نظر تھا، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱ - ''نبی بنگشا،،: (سلسلۂ انبیا) احادیث، تخلیق کائنات سے بعثت رسول مقبول تک۔

۲ - ''شب معراج،،: رسول مقبول ص کی روحانی فتوحات کا بیان۔

۳ - ''رسول وجے،،: (مغازیٔ رسول) اسلامی تعلیمات' ابتدا شب معراج سے ہوتی ہے۔

۴- ''وفات رسول،، : پیغمبر صلعم کے حالات - '' وفات رسول ،، شاعر کی آخری نظم ھے اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کے انحطاط کا اظہار کرتی ھے - موضوع کی حسرت آمیزی کے باوجود یہ نظم ھمارے جذبات کو متاثر کرنے سے قاصر رهتی ھے- حتیٰ کہ فرشتۂ موت (عزرائیل) جب حضرت کے پاس آتا ھے اور حضرت اپنی امت کی جدائی سے بیقرار ھو جاتے ھیں تو اس موقعہ کو بیان کرتے وقت بھی شاعر حقیقی المیہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ھو سکا-

(۵) ''جیکم راجرلڑائی،، : یہ اٹھارہ صفحہ کی ایک مختصر سی نظم ھے جس میں حضرت محمدصلعم اور حضرت علیرض کی '' جیکم ،، نامی ایک کافر بادشاہ سے جنگ کا حال لکھا ھے - بادی النظر میں یہ کوئی الگ نظم نہیں معلوم ھوتی بلکہ ایک دوسری بڑی تصنیف ''رسول وجے'' (مغازیٔ رسول) کا ایک جزو ھے-

(۶) '' ابلیس نامہ '' : (یا '' نور فراموش ،، نامہ) یہ بھی ۳۰۰ اشعار کی ایک مختصرنظم ھے جو''پایار،، (مثنوی

کے انداز) میں لکھی گئی ھے - اور '' نبی بنگشا'' کے فوراً بعد تصنیف ھوئی تھی - جس کا تذکرہ مصنف نے ''شب معراج'' کے آغاز میں اس طرح کیا ھے :

'' میں انبیا' کی مدح سرائی کر چکا ھوں
اور شیطان کی رسوائی اور ذلت کا بیان بھی ''

اسطرح گویا '' نبی بنگشا ،، (سلسلہ' انبیا) اور '' ابلیس نامہ ،، کی طرف اشارہ کیا ھے - اس کتاب میں مصنف نے دو اخلاقی نتیجے پیش کرنے کی کوشش کی ھے :-
(۱) پیر یعنی روحانی مقتدا ھر وقت اپنے مرید کی عقیدت کا سزاوار ھے (۲) عظمت کے زوال کا حقیقی سبب غرور و تکبر ھے - اس امر کی تصدیق شیطان کی تباھی و بربادی سے ھوتی ھے جو ملائکہ' خداوندی میں سب سے زیادہ برگزیدہ تھا - اس کے زوال کا سبب صرف یہ ھوا کہ اس نے تکبر سے خدا کے حکم سے سرتابی کر کے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا - اس کے تنزل کے باوجود خدا فرشتوں کو شیطان کا احترام کرنے کا حکم دیتا ھے جو کبھی ان کا معلم رہ چکا تھا -

شاعر آخر میں اپنی رائے اس طرح ظاھر کرتا ھے :-

" مرید چاہے فرشتہ ہی کیوں نہ ہو
اور شیطان الرجیم اس کا معلم (مرشد) ہو
مرید کو اپنے مرشد کی طرف سے بدگمانی نہ کرنی چاہئے
بلکہ اس کا حکم ماننا چاہئے
فرشتوں کو رب العزت کا یہی حکم تھا ۔
اس نے ان کو ابلیس کا ادب کرنے کا حکم دیا
جو ان کا معلم تھا ۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو اور اپنے
مرشد کی کبھی برائی نہ کرو اس کے حضور خود پسند اور
مغرور نہ ہو ۔

(۷) " جنن پرادیپ " (چراغ زندگی) :
اس نظم میں بھی " جوگ قلندری " کی تعلیم دی گئی
ہے ۔ لیکن یہ سید سلطان کے آخری زمانہ کی تصنیف
ہے ۔ شاعر اس وقت تک پیر شاہ حسین کا مرید ہو چکا
تھا اور مسائل تصوف سے پوری آگاہی حاصل کرلی تھی ۔
اس کتاب میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی اور ہندو تصوف
کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ تصوف کے ان تمام
طریقوں کا علم اس نے اپنے پیر سے حاصل کیا ہے جس
کا اقرار ان الفاظ میں کرتا ہے :-

"پیر شاہ حسین ایک سمندر کے مانند ہیں
میں نے عقل کی یہ دولت انہیں سے حاصل کی ہے"

وہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ تصوف کا علم عام انسانوں کی دسترس سے باہر ہے۔ مسائل تصوف کا مطالعہ کر کے کوئی شخص صوفی نہیں بن سکتا بلکہ اس کے لئے کسی پیر کے قدموں میں رہنا ضروری ہے۔ اس بحث کے دوران میں سید سلطان جہاں کہیں کسی ایسے نکتہ پر پہونچتا ہے جس کو بے نقاب کرنے کی اسے ممانعت ہے تو وہ اپنے قاری کو "پریم نندا" کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیتا ہے جو ظاہر ہے کہ اس کے پیر کے سوا کوئی اور نہیں۔

"جیون پرادیپ" (چراغ زندگی) میں اس کی تعلیمات کا لب لباب اس حدیث سے مطابقت رکھتا ہے کہ "من عرف نفسہ عرف ربہ" یعنی اگر تو خدا کو جاننا چاہتا ہے تو خود اپنے آپ کو پہچان۔ شاعر وجود انسانی کے متعلق خیالات کے اظہار سے نظم شروع کرتا ہے اور آگے چل کر روحانی ولایات مثلاً لاہوت، ناسوت، جبروت، ملکوت' وغیرہ کا بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ 'ذکر، رابطہ، 'مراقبہ، اور اسی قسم کے دوسرے صوفیانہ مراحل کا ذکر کرتا ہے۔

(ص) معرفتی راگ : (صوفیانہ کلام) : قرون وسطیٰ کے بیشتر صوفی شاعر تھے - ان کا کلام دواوین اور کتابت کی شکل میں محفوظ ہے - صوفی شاعر سید سلطان نے بھی بہت سی صوفیانہ نظمیں لکھی تھیں - گو وہ علیحدہ (کتابی) شکل میں تو ترتیب نہیں دی گئیں لیکن وہ مختلف بیاضوں اور منتخب اشعار کے مجموعوں میں ضرور شامل ہیں -

(ط) پداولی : صوفیانہ اشعار کے علاوہ سید سلطان نے " پداولیاں " بھی تصنیف کی تھیں جو اس زمانہ میں کافی مقبول تھیں - ان میں سے کچھ گیت " راگ مالا " میں محفوظ ہیں -

سید سلطان کا وطن چکرانسالا (نہانہ پاٹیا) ہے جو چاٹگام کے علاقہ میں واقع ہے - وہ اندازاً ۱۵۵۰ء سے ۱۶۴۸ء تک پراگل پور میں مقیم رہے - شاہ حسین ان کے پیر و مرشد تھے اور مریدین میں محمد خاں سب سے زیادہ مشہور ہیں - ان کے ایک دوسرے مرید فتح خاں بھی " پد " لکھنے میں کافی شہرت کے مالک ہیں -

سید سلطان ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے - وہ شاعر بھی تھے ، مورخ بھی اور گیت نگار بھی - حالانکہ ماحول

کے اثرات کی وجہ سے ہم ان کے کلام میں ھندو مسلم خیالات کا امتزاج پاتے ھیں لیکن بیشتر انھوں نے اسلامی نظریات کی تعلیم دی ہے۔ ایک جگہ انھوں نے بنگالی مسلمانوں کی بد قسمتی پر تاسف بھی کیا ھے کہ وہ بنگال میں پیدا ھوئے جہاں انہیں عربی سیکھنے کا موقع میسر نہیں ھے، جو اُن کی دینی زبان ھے ('' شب معراج ،،) ۔ انھوں نے '' نبی بنگسنا،، ''شب معراج،، ''ابلیس نامہ'' ''رسول وجے،، اور دیگر کتابیں اور نظمیں تصنیف کیں ۔ جو دینی خیالات بر مبنی ھیں ۔ لیکن اس کی وجہ سے وہ قدامت پرست طبقہ میں نا مقبول ھوگئے ۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ھے کہ:

'' اپنی اصلی زبان سے بے بہرہ
لوگ مجھے پنچالیاں (پنچ پیتیاں) لکھنے کا مجرم قرار دیتے ھیں
وہ مجھے غدار کہہ کر پکارتے ھیں
اور کہتے ھیں کہ میں نے اسلامی صحیفوں کو
ھندوؤں کے عقائد کے سانچے میں ڈھال دیا ھے ،،

بہر حال ، اس بات سے اُن کا حوصلہ پست نہیں ھوتا ۔ چنانچہ آگے چل کر فرماتے ھیں :۔

''خدائے ذوالجلال جانتا ھے کہ میں نے یہ سب کچھ

بھلائی کے لئے کیا ھے - میں صرف اسی ایک ذات
کے سامنے جواب دہ ھوں ،،

غرض یہ کہ وہ اپنے مشن پر قائم رھے لیکن مندرجہ بالا واقعات سے یہ ضرور پتہ چلتا ھے کہ سولھویں اور سترھویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں بنگالی زبان میں اسلام کی تبلیغ کرنا رجعت پسندوں کے نزدیک خلاف مذھب خیال کیا جاتا تھا - اور شاعر کو تنگ خیالی کے اس نظریہ کے خلاف تمام عمر لڑنا پڑا -

شیخ پران اس شاعر کا ابھی تک تفصیلی مطالعہ نہیں (۱۵۵۰—۱۶۱۷ء؟) کیا گیا - راقم الحروف کو اس کی صرف دو کتابوں کا پتہ چل سکا ، یعنی '' نورنا مہ ،، اور ''نصیحت نامہ'' - ان میں سے کسی ایک کا بھی سن تصنیف معلوم نہیں لیکن ان کی تصنیف کے زمانہ کا اندازہ لگانا کچھ دشوار بھی نہیں ھے - یہ مصنف شیخ ''مطلب،، کا باپ تھا - شیخ مطلب ایک شاعر تھے اور ان کی کتاب '' کفایت المصلین ،، قطعہ تاریخ کی رو سے ۱۰۴۹ ھجری مطابق ۱۶۳۹ء کی تصنیف ھے - موصوف بچپن ھی میں یتیم ھوگئے تھے اور اسی لئے ، جیسا کہ خود عبدالمطلب نے لکھا ھے، وہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرسکے - مولوی رحمت اللہ نے انہیں '' کفایت المصلین ،،

لکھنے کی ترغیب دی، انہیں سے اس کتاب کا مواد حاصل کیا گیا ۔ مولوی صاحب نے عرصہ تک ان کے کھانے کپڑے کا بندوبست بھی کیا اور انہیں بڑھایا لکھایا بھی ۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ۱٦۳۹ء میں شاعر کی عمر ۳۹ سال تھی تو وہ غالباً ۱٦۰۰ء میں پیدا ہوا ہوگا ۔ اور اگر باپ کی موت کے وقت اس کی عمر ۱۴ - ۱۵ سال کی تھی تو ۱٦۱۵ء میں شیخ پران حیات نہ ہوں گے لیکن ۱٦۰۰ء میں وہ ضرور بقید حیات ہوں گے ۔

شاعر شیخ پران سید سلطان کے ہمعصر تھے۔ "نور نامہ" میں انہوں نے سید سلطان اور ان کی "نبی بنگشا" کا اس طرح ذکر کیا ہے :-

> سید سلطان نے "نبی بنگشا" میں پہلے ہی ، وہ سب
> کچھ بیان کردیا ہے جو حضرت علی نے حضرت فاطمہ
> سے کہا تھا" ۔

اور اس گفتگو کو اپنے بیان سے حذف کر دیتے ہیں ۔ شیخ مطلب نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ چاٹگام کے ایک مقام سیتا کنڈ کے رہنے والے تھے ۔

"عالی مرتبت شیخ پران سیتا کنڈ میں رہتے تھے

ان کا ناچیز فرزند شیخ مطلب یہ اشعار لکھتا ھے،، -

" نور نامہ " (یا " روز ازل ") میں تخلیق کی داستان بیان کی گئی ھے - اس کی رو سے پہلے " نور محمدی " اور بعد میں کائنات کی تخلیق عمل میں آئی - بنیادی طور پر شاعرانہ ہونے کی بہ نسبت یہ ایک مذھبی تصنیف ھے -

" نصیحت نامہ ،، طبع زاد تصنیف نہیں ھے بلکہ کسی فارسی نظم یا فارسی اقوال کے مجموعہ کا ترجمہ ھے جیسا کہ شاعر نے خود بیان کیا ھے کہ اس نے عوام کے فائدے کے لئے اسے بنگالی میں منتقل کیا ھے -

حاجی محمد " نور نامہ " پر مولوی عبدالکریم (۰۰۰ - ۱۶۲۰) کی شرح شائع ہونے سے قبل ھمیں اس شاعر کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا - اور آج بھی اس کی شخصیت کے متعلق ھماری معلومات محدود ھی ھیں -

حاجی محمد ، شیخ پران اور سید سلطان کا ھمعصر ھے - بلکہ بعض حیثیتوں سے ان دونوں سے بھی قدیم - شیخ پران نے اپنے " نصیحت نامہ " میں حاجی محمد کا ذکر کرتے ہوئے اس عالمانہ بحث کی تعریف کی ھے جو انہوں نے " صورت نامہ " میں ایمان کے لوازم بیان کرنے کے سلسلے

میں لکھی ہے۔

بنا بریں حاجی محمد کا شمار شیخ پران کے پیش رؤں میں ہوتا ہے اور اگر وہ ان کے همعصر بھی مان لئے جائیں تو باعتبار عمر وہ شیخ سے بڑے تھے ۔ ہم یہ باور کرتے ہیں کہ وہ پران کے همعصر تھے جن کا زمانۂ حیات ۱۵۰۰ء اور ۱۶۲۰ء کے درمیان ہے ۔

شیخ پران کے مندرجۂ بالا حوالے سے یہ ظاہر ہے کہ " نور جمال " کے علاوہ حاجی محمد نے ایک اور نظم بھی لکھی تھی جس کا نام " صورت نامہ " ہے جو " ایمان " اور دوسرے مذہبی مسائل پر مشتمل ہے۔

" نور جمال " میں " شریعت " اور " طریقت یا معرفت " کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے پہلے حصہ میں مسائل شریعت کا بیان ہے۔ مثال کے طور پر ہم اس حصہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں " توبہ " پر بحث کی گئی ہے :

" اے وہ لوگوں کہ جو نماز پڑھتے ہو۔
جاننا چاہئے کہ بغیر توبہ کے تمہاری تمام نمازیں
بے کار ہیں۔

تم میں سے جن لوگوں نے گناہ کئے ہیں وہ بھی اسی وقت
اپنی ندامت کا اظہار کریں، بلا مزید تاخیر کے۔
اگر تم پشیمان ہوجاؤ تو خدا تمہارے گناہ معاف
کر دے گا۔
اور پھر آئندہ ان گناہوں کا اعادہ نہ کرو،،

دوسرے حصہ میں شاعر ''طریقت'' پر بحث کرتا ہے۔
اس نے ان تمام آزمائشوں کو بیان کیا ہے جن سے ہر اس
شخص کو مختلف صوفیانہ مدارج مثلاً ''ناسوت''، ''لاہوت''
اور ''ملکوت'' وغیرہ طے کرنے سے قبل گذرنا چاہئے۔
اس نے ان مدارج کے مفہوم کا بھی تفصیل سے ذکر کیا
ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں وہ حصہ نقل کرتے ہیں
جہاں اس نے درجہ ''ملکوت'' پر فائز ہونے کا بیان لکھا ہے:-

''نور جمال تمہیں روحانی حقائق سے آگاہ کرتا ہے جب
ذہن سوائے ذات باری کے کسی اور طرف منتقل
نہیں ہوتا
اور مستقلاً حق کی طرف لو لگا لیتا ہے
وہ حقیقت کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے
حتیٰ کہ اپنے وجود کو بھی فراموش کر دیتا ہے،،

''نور'' کی دو قسمیں ہیں۔ جلال اور جمال - روح کے لئے جلال کا تجربہ بہت سخت ہوتا ہے اور اس سے احتراز کرنا چاہئے - لیکن جمال روشن اور خوشگوار ہے اس کا اکتساب کرنا چاہئے - اور اس بنا پر شاعر نے نظم کا عنوان ''نور جمال'' رکھا ہے۔ مندرجۂ بالا اقتباس میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ روح کس طرح ''مقام ملکوت'' پر فائز ہو سکتی ہے۔

شاعر نے ''توحید وجودی'' اور ''توحید شہودی'' کے نظریہ پر بھی خصوصیت سے بحث کی ہے۔ سولھویں صدی اور سترھویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں شمالی ہند میں یہ نظریہ کافی مقبول تھا - شاعر کے خیال میں خالق اور مخلوق ایک ذات مشترک ہونے کے با وجود مابہ‌الامتیاز ہیں۔ یہ نظریہ ''دوئی'' اور ''وحدت'' کے نظریات کا مجموعہ ہے۔ شاعر کہتا ہے:

''جس کا نام محمد ہے

خدا نے انہیں اپنا حبیب کہا

اور اسی کے سبب اس نے (خدا نے) اس کائنات کو تخلیق کیا

ایک سے دو اور دو سے سب وجود میں آئے

اسی طرح جیسے بیج سے درخت آگتا ہے اور درخت سے پھل
پیدا ہوتے ہیں۔
پھل، درخت اور بیج ایک ہی چیز کے تین نام ہیں
ایک سے تین ہوجاتے ہیں اور تینوں مل کر ایک۔
انھیں علیحدہ نہیں کیا جاسکتا
لیکن پھل کو ہم درخت نہیں کہہ سکتے
بالکل ایسا ہی رشتہ خالق حقیقی اور مخلوق میں ہے
ہر تخلیق خدا ہی کی طرف سے وجود میں آتی ہے
جیسے پھل درخت سے مختلف چیز ہے
ایسے ہی خدا اور انسان میں بھی فرق ہے''

اس کے بعد سوال کیا گیا ہے کہ ''آیا خدا اور انسان غیر منفک وجود ہیں؟ کیا انسان کی موت (نعوذ باللہ) خدا کی موت تصور کی جاسکتی ہے''؟ اس کے جواب میں شاعر کہتا ہے کہ سمندر اور لہریں اگرچہ دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر اس کے باوجود لہریں سمندر کے وجود کا اعلان کرتی ہیں۔ لہریں اٹھتی ہیں اور گرجاتی ہیں لیکن موجوں کے گرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سمندر کا وجود ختم ہوگیا۔ انسان فنا ہوتے رہتے ہیں لیکن خدا کی ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

''انسان کے عمل سے خدا کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا
اس کی مخلوق کی فنا اس کے عدم وجود پر دلالت
نہیں کرتی
وہ ہمیشہ سے تھا ، ہر وقت موجود ہے ، اور اس کی ذات
ہیشہ رہنے والی ہے۔

شاعر بڑا پرہیزگار مسلمان تھا۔ سفر حج سے مشرف ہوا۔ جو اس زمانہ میں فی الحقیقت باعث سقر خیال کیا جاتا تھا۔ اسے ایک پیر کی حیثیت حاصل تھی اور کافی لوگ اس کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے جن میں سے محمد شفیع کا نام قابل ذکر ہے۔

یہ کتاب عام مسلمانوں کے لئے وعظ و پند سے بھری پڑی ہے۔ شاعر نے مقصد شاعری پر بھی اپنے خاص انداز میں بحث کی ہے جس سے اس زمانہ میں فن شاعری کے متعلق خیالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نصراللہ خاں یہ شاعر بھی ابھی تک گمنامی (؟١٠٠٦ — ١٦٢٥) کے عالم میں تھا۔ صرف مولوی عبدالکریم نے اپنی کتاب ''بنگلہ پراچین پونتھیرو وارن'' میں اس کا سرسری سا ذکر کیا ہے۔

هم اس کی چار کتابیں دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو یہ ہیں :-

(۱) جنگ نامہ

(۲) موسار سوال (سوالات موسیٰ)

(۳) شریعت نامہ

(۴) ہدایت الاسلام - (یہ کتاب ہنوز راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذری)

ان میں سے ''جنگ نامہ'' اور ''شریعت نامہ'' میں شاعر کے خود نوشت حالات شامل ہیں - لیکن بد قسمتی سے کسی کتاب میں بھی اس کا سن تصنیف نہیں دیا گیا - ویسے خود نوشت حالات کے بعض بیانات کی روشنی میں ان تاریخوں کا ایک اندازہ کرسکتے ہیں - مثال کے طور پر ''شریعت نامہ'' میں بیان کیا گیا ہے :-

''حمید الدین خان گوڑ کی ''شقوں'' کے شقدار تھے جہاں وہ کمانڈر انچیف کی حیثیت سے متعین تھے - ان کے بیٹے برہان الدین خان اپنے آٹھ دوستوں کے ہمراہ ''رؤشنگ'' پہونچے - ''رؤشنگ'' کے راجہ نری پا موکھیا کے یہاں سوار فوج نہ تھی - اس نے برہان الدین کو اپنی پیدل فوج کا

کمانڈر مقرر کر دیا بعد میں ابراھیم خان کا اپنے والد کی جگہ تقرر عمل میں آیا ۔ ان کے بعد ان کا لڑکا شجاع الدین خاں اس عہدہ پر فائز ھوا ۔ لیکن انکے فرزند بابو خاں (شیخ راجہ) تارک الدنیا ھو گئے اور ''فقیر موڑل'' کے نام سے مشہور ھوئے ۔ بابو خاں کے بیٹے اسحاق خاں نے بحیثیت خواندکار معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا اور انہیں ''شریف'' کا خطاب ملا ۔ نصراللہ انہیں کے بیٹے تھے ۔

اس طرح ھمیں یہ سراغ ملتا ھے کہ نصراللہ خان کے آبا و اجداد رؤشنگ آئے ۔ وھاں نری پا مکھیا کے وزرائے لشکر مقرر ھوئے ۔ اب سوال یہ ھے کہ نری پا مکھیا کون تھا ؟ اراکن کی تاریخ کے تحقیقی مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ھے کہ وہ برمی تاریخ کے نرومکھیا اور اراکان کے مینگ سان وان کے علاوہ اور کوئی دوسرا نہیں ھو سکتا ۔ اس نے ۱۴۰۴ء سے ۱۴۳۴ء تک اراکان پر حکمرانی کی ۔ تحت نشین ھونے کے بعد وہ برما کے حکمراں واسو کی بہن کو بالجبر لے بھاگا اور بعد میں برما کے حکمراں نے اس شرمناک حرکت کی وجہ سے اس کو اس کی مملکت سے مار بھگایا ۔ اس نے ۱۴۳۰ء تک یہ زمانہ ایک جلا وطن

کی حیثیت سے گوڑ میں بسر کیا جبکہ جلال الدین محمد شاہ نے اس کا کھویا ھوا تخت و تاج پھر اسے واپس دلا دیا ۔ غالباً یہی وہ زمانہ تھا کہ جب برھان الدین اس کے وزیر لشکر مقرر ھوئے ۔ اگر ھم چار پشتوں کے لئے سو سال کا زمانہ تسلیم کر لیں تو جلال الدین کے تخت و تاج دلانے تک ۱۷۵ سال کا عرصہ گذرا ھوگا جبکہ نصراللہ پیدا ھوئے ۔ اس حساب سے نصراللہ ۱۶۰۵ میں بقید حیات ھونگے ۔

''جنگ نامہ'' میں مرقومہ سوانحی تفصیلات کے مقابلہ سے بھی ھمیں یہی تاریخیں دستیاب ھوتی ھیں ۔ اس تصنیف کی رو سے ان کے والد منصور خاں خواندکار کو بادشاہ فتح خاں (شاعر نے اسے فاتح خاں لکھا ھے) نے مکرم خسروانہ سے سرفراز فرمایا تھا جو ''رمتو،، (جو غالباً رمھو یا رامو ھے) کا بادشاہ تھا ۔ یہ مقام چاٹگام کے جنوب میں واقع تھا ۔ اس بادشاہ نے بھی انہیں اپنی نوازشات سے سرفراز کیا تھا جس نے شہنشاہ دھلی سے فوجی دستے مستعار لیکر رؤشنگ فتح کیا تھا ۔

مذکورہ فتح خاں ایک مشہور تاریخی شخصیت ھے ۔ وہ پرتگالیوں کی بحری فوج میں کپتان تھا ۔ اس نے ۱۶۰۰ء

اور ۱۶۰۸ء کے درمیانی زمانہ میں بغاوت کرکے ساندویپ میں پرتگالیوں کے ایک اہم قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت ساندویپ اور چاٹگام کے شمالی و جنوبی متصل علاقوں پر پرتگالی لٹیروں کے سر براہ گنجالیس کی حکومت تھی۔ ساندویپ فتح کرنے کے بعد فتح خاں نے پرتگالی فوج کو تہہ تیغ کردیا تھا۔ گنجالیس اس وقت شہباز پور، ضلع باقرگنج کے جنوب میں مصروف تھا۔ ایک جنگ میں جو فتح خاں اور گنجالیوں کے مابین ۱۶۰۹ع میں واقع ہوئی فتح خاں مارا گیا اور گنجالیس ساندویپ اور چاٹگام کے شمالی وجنوبی علاقہ کا مطلق العنان حکمراں بن گیا۔ ٹھیک اسی وقت اراکان میں خانہ جنگی کے فوراً بعد ایک شاہی خاندان موسومہ ,,ان پورم،، نے گنجالیس سے حمایت طلب کی۔ اس کے بعد وہ دغلی گیا۔ اراکان کے حکمراں نے ۱۶۱۶ع میں گنجالیس کو چاٹگام سے گوا کی طرف مار بھگایا اور بنگال کی تاریخ سے ہمیشہ کے لئے اس کا نام مٹ گیا۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شاعر کے والد ۱۶۰۰ع اور ۱۶۱۶ کے درمیانی زمانہ میں زندہ تھے۔ شاعر اس وقت ایک درمیانی عمر کا آدمی ہوگا۔ لہذا ۱۶۲۵ع میں اگر شاعر

کی عمر تقریباً ۶۰ سے ۶۵ سال تھی تو وہ ۱۵۶۰ء یا ۱۵۶۵ء میں پیدا ہوا ہوگا۔

شاعر راسو کا باشندہ تھا جو چاٹگام کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس کے پیر کا نام حمیدالدین تھا جن کا ذکر اس نے ''جنگ نامہ'' میں متعدد مقامات پر بہت احترام سے کیا ہے۔ چاٹگام کے علاقہ میں ان دنوں قاسم بازار ایک بہت بڑی منڈی تھی۔ اور وہاں ایک بلند پہاڑی تھی جسے ,جہاں نماں' کہتے تھے۔ اس پہاڑی کو ''جہاں نماں'' اسلئے کہا جاتا تھا کہ اس کی چوٹی پر کھڑے ہوکر لوگ بہت دور دور تک دیکھ سکتے تھے۔

اب ہم ایک ایک کرکے اس کی تصانیف پر بحث کریں گے :-

(۱) ''جنگ نامہ''۔ یہ غالباً اس کی پہلی تصنیف ہے۔ شاعر خود کہتا ہے کہ :-

''نیک سیرت شریف منصور ایک سیدانی کے بطن سے ہیں۔
ان کے بیٹے نصراللہ نے جو ابھی نیم خواندہ اور نا پختہ
ہیں یہ پنچالیاں (پنج بیتیں) تصنیف کی ہیں۔''

''نا پختہ'' کی اصطلاح یہاں اس کی کم عمری کی طرف

اشارہ کرتی ہے۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یہ لفظ اظہار کسر نفسی کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ بہر حال نظم کا اسلوب ناپختگی کو ضرور ظاہر کرتا ہے۔

جہاں تک موضوع کا تعلق ہے وہ عام دلچسپی کا ہے۔ شاعر کا اصل مقصد حضرت محمد الرسول اللہ صلعم کی طرف سے شیر خدا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی کفار سے جنگ کا حال بیان کرنا ہے۔ یہ نظم اسی قسم کی ہے جیسے "رسول وجے" (مغازی رسول)۔ اس میں بہت سے مافوق الفطرت واقعات بھی درج ہیں۔ اس نظم کو بے عیب تو نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ ضرور ہے کہ شاعر کو عروض کے علم پر دسترس حاصل ہے۔

(ب) "موسار سوال"(سوالات موسیٰ): یہ ایک مختصر سی نظم ہے۔ اس کا نام "سوالات موسیٰ" ہے اس سے اس کے موضوع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کوہ طور پر خدا سے ہم کلام ہوتے تھے۔ جب کوئی دشواری پیش آتی تو براہ راست خدا سے رجوع کرتے تھے۔ اس قسم کا مکالمہ شاعر نے سوال و جواب کی شکل میں نظم کیا ہے۔ اس کتاب میں عبادت کی عظمت خاص طور سے بیان کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انبیا میں صرف حضرت موسیٰ کو ہی خدا سے براہ راست ہمکلامی

کی سعادت حاصل ہوئی اور صرف حضرت محمد صلعم کو
معراج کے موقع پر شرف ملاقات بخشا تھا اور ہمکلامی کی عزت
عطا فرمائی تھی، لیکن طور پر نہیں بلکہ عرش پر۔ حضرت محمد
صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو، ان کے امتی، دن میں پانچ مرتبہ
نماز کے دوران میں معراج کے مماثل شرف حاصل کرسکتے ہیں۔
اور تلاوت قرآن پاک کے ذریعے خدا سے ہمکلام ہوسکتے ہیں۔

شاعر اپنی اس کتاب کو کسی فارسی کتاب کا ترجمہ
ظاہر کرتا ہے۔

(ج) ''شریعت نامہ،،: انداز بیان اور وزن و بحر پر شاعر کی
گرفت کے اعتبار سے یہ نسبتاً زیادہ پختہ اور مکمل تصنیف
معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت تک شاعر ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت
سے شہرت حاصل کرچکا تھا۔ غالباً اسے اپنے والد کی صلاحیتیں
ورثہ کے طور پر ملی تھی اور خود اسے بھی کاملیت کا درجہ
حاصل ہوگیا تھا جس کا اندازہ مندرجہ ذیل قسم کے اقتباسات
سے کیا جاسکتا ہے :-

'' بسم اللہ الرحمن الرحیم ''

''شریعت نامہ'' کے اقوال کو سنو

ہر وہ شخص جو سچا مسلمان ہے یقیناً ان پر عمل کریگا

اگر کوئی مسلمان شریعت پر عمل نہیں کرتا
تو وہ مسلمان کہاں رہتا ہے ؟
'' امر '' اور '' نہی '' کے معانی کو نظر میں رکھو۔
عربی میں '' امر '' کے معنے ہیں خدا کا قطعی حکم
اور '' نہی '' کے معنے ہیں اس کا منفی حکم یا ممانعت ''
مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب
کا مقصد اصول دین اسلام نظم کرنا تھا۔ '' امر '' سے
متعلق حصہ '' قطعی احکام '' کے بیان پر مشتمل ہے اور جس
حصہ میں '' نہی '' کا بیان ہے اس میں ممنوعات پر
بحث کی گئی ہے۔

چند 'پد' نگار شاعر: '' برج بولی '' کو '' پداولی ادب ''
(۱۵۶۰ء - ۱۶۳۰ء؟) میں ایک نمایاں مقام حاصل
ہے۔ یہ برج دھام یا متھرا بندرا بن کی زبان نہیں ہے۔ متھرا
کی زبان '' برج بھاکا '' ہے۔ '' برج بولی '' کسی خاص
مقام کی روزمرہ بھی نہیں ہے۔ یہ صرف شاعری کی زبان ہے۔
یہ ودیاپتی کی میتھلی اور بنگلی پد نگروں کی زبان کا مرکب
ہے۔ اور اس لئے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں '' برج بولی ''
کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بنگلی پد نگروں کی تخلیقی صلاحیتوں کی

پیدا وار ہے اور اس کی نشوونما کم و بیش اسی طرح ہوئی جس طرح شمالی ہند میں اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ لیکن "برج بولی"، محض ایک تحریری اور شاعرانہ زبان ہے۔کیونکہ اس مصنوعی زبان (بولی) کا رادھا اور کرشن کی عشقیہ حکایات سے تعلق ہے اسلئے لفظ "برج" جو "برج دھام" (سر زمین برج) سے ماخوذ ہے بولی کے لفظ سے پہلے جوڑ کر اسے "برج بولی" کا نام دیا گیا۔ لہذا پدوں میں "برج بولی" کا استعمال ایک ادبی روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کوئی مذہبی یا طبقاتی اہمیت نہیں ہے۔ مسلمان شاعروں نے بھی اپنے گیتوں میں اسے آزادانہ طور پر استعمال کیا ہے۔ اس قسم کے استعمال کی نمایاں مثال دولت قاضی کی "بارہ ماشی" یا "ستی مینا" (تصنیف ۱۶۲۲—۱۶۳۸ء) ہے۔ وہ اس زبان کو عشقیہ شاعری کے لئے استعمال کرتا ہے لیکن رادھا اور کرشن کے رومان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

برج بولی میں 'پد' لکھنے کا رواج سولہویں صدی کے نصف آخر اور سترھویں صدی (عیسوی) کے نصف اول میں عام ہوگیا تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب گووند داس

(۱۶۱۳—۱۶۳۵)، بلرام داس (؟۱۶۱۰—۱۶۳۵؟)، جنن داس (؟۱۶۱۰—۱۶۳۰)، رائے شیکھر (گووند داس کے ھمعصر) کوی ولبھ (۱۵۹۸ء) اور دوسرے مشہور ویشنوی پد نگاروں نے بے شمار پد لکھے اور بنگالی زبان کو "برج بولی" کی شیرینی سے معمور کر دیا ۔ اور برج بولی میں پد اور گیت' خصوصاً عشقیہ گیت' لکھنے کو ایک مستقل ادبی روش کی حیثیت حاصل ھوگئی ۔

برج بولی کے استعمال میں بنگالی مسلمان بھی ھندوؤں سے کسی طرح پیچھے نہیں رھے ۔ پانچ مسلمان شاعروں کے "پد"، ایک مشہور وشنوی مجموعے میں' جس کا نام "گوڑ پد ترنگنی"، اور "پدا کلا بترو"، (مرتبہ اٹھارویں صدی، نصف اول) ھے یکجا کر دئے گئے ھیں ۔ اس سے یہ بات بھی ظاھر ھوتی ھے کہ اٹھارویں صدی کے نصف اول میں وشنو عقیدہ کے پیرو مسلمان شاعروں کے لکھے ھوئے پد بلا تکلف استعمال کرتے تھے ۔ مسلمان پد نگاروں کو وشنو عقائد کے پیرو کہنا اس زمانے کی مزاجی افتاد سے قطعی لاعلمی پر مبنی ھے ۔ اس کے برخلاف اس بات کا وافر ثبوت موجود ھے کہ مسلمان پد نگار بڑے پکے مسلمان تھے جنھوں نے ایسی

نظمیں بھی لکھی ہیں جو بنیادی طور پر اسلامی خصوصیات کی حامل ہیں ۔

دو چار شاعر جن کا کلام مذکورہ وشنوی مجموعوں میں شامل ہے، اواخر سولھویں صدی اور اوائل سترھویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں، جبکہ یہ طرز عام طور پر رائج تھا ۔ ورنہ ایسی خالص برج بولی میں جو انہوں نے استعمال کی ہے وہ ''پد'' نہ لکھ سکتے ۔ گو ان کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں لیکن ہم ان کی تصانیف پر تھوڑی بہت روشنی ڈالنے کی کوشش کرینگے ۔

(۱) ''شاہ اکبر'' : اس زمانہ کے پد نگاروں میں شاہ اکبر کو قدیم ترین پدنگار تسلیم کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں ۔ ان کا صرف ایک پد ہم تک پہونچا جو ''گوڑ پد ترنگنی'' (صفحہ ۱۰) میں شامل ہے ۔ مذکورہ 'پد' وشنوی ادب کی ''گورا چندریکے'' شاخ سے تعلق رکھتا ہے ۔ اور ''شری جیتنیا'' کی زندگی اور معجزات پر مشتمل ہے ۔ ''گورا چندریکے'' پد لکھنے والوں میں سے بشیتر سولھویں صدی میں گذرے ہیں اور قرین قیاس ہے کہ شاہ اکبر بھی سولھویں صدی ہی میں مصروف عمل تھے ۔ ان کا واحد پد اس قسم کا بہترین پد شمار

کیا جاتا ہے ۔ شاہ اکبر ایک صوفی منش بزرگ تھے اور
ان کا حلقہ مریدین بہت وسیع تھا ۔ ان میں سے ایک کا نام
عین الدین تھا جو کم سے کم پندرہ پدوں کے مصنف تھے ۔
یہ پد حال ہی میں بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں ۔
(ب) ''نصیر محمود'' : ان کا صرف ایک ''پد'' ''پدا کلا پترو''
(نمبر ۱۳۲۹) کے اس حصہ میں شائع ہوا ہے جو ''مسلمان
وشنو شاعروں'' سے متعلق ہے ۔ یہ پد جو نہایت شیریں زبان
میں لکھا گیا ہے نظم کے اعلیٰ معیار کو پیش کرتا ہے ۔
(ج) ''کبیر'' : اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ آیا یہ
مشہور ''شیخ کبیر'' ہیں یا کوئی دوسرے شاعر ہیں ۔ ان
کا بھی ایک پد ''گوڑ پد ترنگنی'' میں شامل ہے ۔ اس میں
''ہولی'' یعنی رادھا کرشن کے کھیلوں کا ذکر ہے ۔

(د) ''سال بیگ'' (صالح بیگ) : ان کے تین پد ''پد کلا پترو''
(نمبر ۱۵۴۲ ، ۲۳۷۲ ، ۲۹۷۲) میں جمع کئے گئے ہیں ۔
''پد رتناولی'' میں بھی جو ہنوز شائع نہیں ہوئی ان کا ایک
پد (نمبر ۳۴۳) شامل ہے ۔ ''اڑیا ادب کے خصوصی انتخاب'' میں
بھی جو کلکتہ یونیورسٹی سے شائع ہوا ہے ان کے چند اشعار
شامل ہیں ۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کے نام میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔
حال ہی میں ان کا ایک پد دستیاب ہوا ہے۔ مقطع کا مصرعہ
اس طرح ہے :- ''گناھگار صالح بیگ کہتا ہے'': یہ
'صالح بیگ' سوائے 'سال بیگ' کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔
یہ پد بھی برج بولی میں لکھا گیا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سال بیگ یا صالح بیگ اڑیسہ کے
باشندہ تھے۔ اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔
اس وقت اڑیسہ بنگال کا ایک حصہ تھا۔ اڑیا زبان کی ایک
کتاب ''دردھیا بھکتی'' کے مطابق ایک پٹھان نے ایک ہندو
بیوہ سے شادی کرلی تھی جس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا
ہوا۔ لیکن اس قصہ کی موافقت میں ہمارے پاس کوئی ثبوت
نہیں ہے کہ وہ بعد میں وبشنوی ہو گیا اور اس نے اپنی زندگی
کے آخری ایام ''برج دھام'' میں بسر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

محمد خاں

(۱۵۸۰ء تا ۱۶۵۰ء) سترھویں صدی کے شاعروں کی صف
میں محمد خاں کو بہت ممتاز
مقام حاصل ہے۔ وہ چٹگام کے علاقے، ہت ہزاری' کے
رہنے والے تھے اور چٹگام کے مشہور بادشاہ راستی خان کی

ساتویں پشت میں تھے ۔

موضع گوبرا ' علاقہ ہت ہزاری ' میں (جومشہور شاعر علاول کی جنم بھومی بھی ہے)' راستی خاں کے نام سے ایک مسجد ہے اور اس مسجد سے ایک سنگین کتبہ دستیاب ہوا ہے جسے اب مسجد علاول خاں میں نصب کردیا گیا ہے۔ زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ محمد خاں بھی اسی موضع گوبرا میں پیدا ہوئے تھے ۔ مقیم (۱۷۷۳) نے شعرائے چٹگام کے تذکرے میں محمد خاں کو سید سلطان کے فوراً بعد جگہ دی ہے۔ اس ترتیب کی وجہ غالباً مقیم کا یہ خیال ہے کہ محمد خاں کو سید سلطان سے تلمذ حاصل تھا ۔ محمد خاں نے اپنے خاندانی حالات مثنوی '' مقتول حسین ،، کے دیباچے میں تحریر کئے ہیں۔ اس کا حوالہ دینا اس لئے بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی دو اور کتابوں میں بھی سن تصنیف درج کیا ہے۔ اب تک ان کی سات تصانیف کا پتہ چلا ہے ۔ ان کی سن وار فہرست حسب ذیل ہے :-

۱ — ستیہ کالی وواد سنگباد
۲ — حنیفر لڑائی
۳ — اصحاب نامہ — یہ کوئی علیحدہ تصنیف نہیں 'بلکہ مقتول حسین ،، ہی کا ایک جزو ہے ۔

۴ — ''مقتول حسین''

۵ — ''قیامت نامہ'' (یہ بھی ''مقتول حسین'' کا گیارھواں مرثیہ ہے)

۶ — '' دجال نامہ '' (یہ '' قیامت نامہ'' سے الگ ایک تصنیف ہے)

۷ — ''قاسمیر لڑائی '' (حضرت قاسم کی سر گزشت یا جنگ)

''ستیہ کالی '' '' اور حنیفر لڑائی '' میں کہیں بھی محمد خاں کے پیر و مرشد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور نہ کسی آخر کے ایسے شعروں میں ہی جہاں انہوں نے اپنے ذاتی حالات کا حوالہ دیا ہے۔

اس سے یہ اندزہ ہوسکتا ہے کہ یہ کلام اس وقت کا ہے جب یہ سلسلۂ تلمذ شروع نہیں ہوا تھا۔ اس ابتدائی کلام میں رنگ بھی مبتدیانہ ہے ۔ باقی کی تین تصنیفات انہوں نے پیرو مرشد کی فرمائش سے لکھی ہیں ۔ ایسا معلوم ہو تا ہے کہ سید سلطان نے اپنے مریدوں یا شاگردوں میں سے محمد خاں ہی کو سب سے زیادہ قابل اور لائق پا یا تھا۔ اور اسی لئے اپنی نا مکمل تصانیف کومکمل کر نے کا کام بھی انہی کے سپرد کیا تھا ۔

خود محمد خاں نے اپنی تینوں تصانیف کو سن وار اس طرح درج کیا ھے :

''نبی بنگشا'' اس عظیم شخصیت کے اپنے رشحات قلم میں سے ھے جسمیں ابتدائے آفرینش کا تفصیلی ذکر کیا گیا ھے۔
انہوں نے وفات حضرت سرورکائنات صلعم کے متعلق اپنی
ایک تصنیف ادھوری چھوڑدی۔
اور بالاخر مجھے حکم دیا کہ میں اسے مکمل کروں
اُن کے ارشاد کی تعمیل میں
میں نے چاروں خلفا رض کی شان میں یہ شعر تحریر
کئے ھیں
دونوں بھائیوں (حضرات حسنین رض) کی شان میں نظم
لکھنے کے بعد
میں نے قیامت سے متعلق باتیں لکھی ھیں
اور آخر میں انوار باری تعالیٰ کا تذکرہ ھے
اس کے بعد کچھ اور لکھنے کی گنجائش ھی نہیں۔
دونوں نظمیں حصہ ھیں
ایک ھی کتاب کا''

یہاں محمد خاں نے دو نظموں کا ذکر کیا ھے۔ ان میں

سے ایک تو سید سلطان کی نظم ''وفات رسول'' ہے اور دوسری ''مقتول حسین'' ۔

اب جیسا کہ آگے ذکر آئیگا' محمدخاں نے ''مقتول حسین'' کے باب دوم میں ''اصحاب کہف'' کا واقعہ نظم کیا ہے' تیسرے باب سے لیکر ساتویں باب تک دونوں بھائیوں (حضرات حسنین رض) کے حالات زندگی قلمبند کئے ھیں اور گیارھویں باب میں روز قیامت کا تصور پیش کیا ہے ۔ اس طرح یہ سب ایک کتاب ''مقتول حسین'' کے مختلف حصے ھیں ۔ البتہ گیارھویں باب کو' جس میں حالات قیامت کا ذکر ہے' ''قیامت نامہ'' کا الگ نام دیا گیا ہے ۔ اسی لئے دسواں باب ختم کرنے کے بعد شاعر نے فہرست مضامین میں لکھا ہے :

''اب آخری یعنی گیارھواں باب شروع ھوتا ہے
اور اس میں حالات قیامت کا ذکر کیا جائیگا''

اب ہم محمد خان کی تصانیف کا الگ الگ ذکر کرتے ھیں :-

(۱) ''ستیہ کالی وواد سنگباد'' : جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یقیناً یہ شاعر کی پہلی تصنیف ہے ۔ قطعۂ تاریخ میں سال تصنیف ۱۶۳۵ء دیا گیا ہے ۔ یہ ایک ضخیم تصنیف

ہے - بالکل شروع ہی میں شاعر نے بہ بتایا ہے، کہ اس کا مقصد '' ستیا کالی وواد سنگ باد ،، کو منظوم شکل میں پیش کرنا ہے -

تمہید کے بعد فہرست میں موضوعات جو درج کئے گئے ہیں ، وہ مختصرا حسب ذیل ہیں:

باب اول : دو شلا سے کالی ، ستیا اور ستیاوتی کی داستان عشق و محبت - کالی ، ستیا سے لڑنے آتا ہے - اس د دیوتا، ''منرا کانت،، بیچ بچاؤ کراتا ہے، پجاری بھی بیچ میں آجاتا ہے لیکن بیچ بچاؤ نہیں ہوتا اور لڑائی شروع ہوجاتی ہے کیونکہ '' نراد '' جو سارے فتنے کی جڑ ہے ، موجود ہے -

باب دوم : ستیا اور کالی کی جنگ کے مناظر اور تفصیل - کالی اپنے مکرو فریب کی بدولت جیت جاتا ہے - ستیا میدان جنگ میں بیہوش ہو جاتا ہے اور اسے اس کے گھر پہنچا دیا جاتا ہے -

باب سوم : ستیا پر غشی طاری رہتی ہے - ستیاوتی کا سوگ -''سبودھی'' اب کرو ، دھننانتری ' کو طلب کرتا ہے اور ستیا کو ''داروئے علم ،، چکھنے کے بعد ہوش آتا ہے - اس کے بعد ستیاوتی جوگن کی سرگزشت ہے -

باب چہارم : اب ستیا کو فتح ہوتی ہے اور مجرم و گنہگار کالی کو غش آجاتا ہے ۔ دو شیلا ، کالی کے لئے ماتم شروع کردیتی ہے جو بظاہر مرچکا ہے مگر دھننانتری جوگی ، کالی کو ہوش میں لے آتا ہے ۔ اس کے بعد جوکن ، دو شیلا ، کی داستان شروع ہوتی ہے ۔

باب پنجم : جنگ ختم ہوگئی مگر لڑائی دنگے جاری رہے اور سارے عہد " تریتا ،، میں چلتے رہے ۔ بالآخر عہد " دسپار ،، میں یہ لڑائی دنگے بھی ختم ہو گئے اور کالی بہت ذلیل و خوار ہوکر گھر واپس آیا ۔

اس پونتھی کے تیسرے صفحہ پر کہانی کا اصل واقعہ بتایا گیا ہے کہ 'نراد ،نے راجہ 'جتھی داسا، کی لڑکی 'دو شیلا، کا بیاہ راجہ کالی کے ساتھ کرادیا تھا جسے اس سے عشق تھا ۔ یہیں سے ساری کہانی شروع ہوتی ہے ۔

جس طرح ملک محمد جائسی کی ,' پدماوت ،، (جسکا بنگلہ میں علاول نے ,, پدماوتی ،، کے نام سے ترجمہ بھی کیا ہے) ایک رمزیاتی نظم ہے ، اس طرح ,, ستیا کالی وواد سنگ باد ،، بھی ایک رمزیاتی نظم ہے ۔ " حق " کی فتح اور " ناحق " کی شکست اصل مرکزی موضوع ہے ۔ اس نظم کا طرز بالکل

مبندیانہ ہے لیکن زمانہ وسطیٰ کے بنگلہ ادب میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی رمزیانی کہانیوں کی یہی ایک یادگار باقی ہے۔

(ب) ''حنیفرلڑائی'': بعض لوگوں نے اس کتاب کو بھی ''مقتول حسین'' کا ایک حصہ قرار دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ۔ یہ ایک بالکل علیحدہ ہی کتاب ہے ۔ اس کے ایک قلمی نسخہ میں جسکا سن کتابت ۱۱۳۴ تری پوراوڈا (یعنی ۱۷۲۴ء) ہے کتاب کے شروع کا حصہ بالکل محفوظ اور اچھی حالت میں ہے۔ اس کی ابتدا ایک طویل دعائیہ نظم سے ہوتی ہے جس میں مقامات مقدسہ کی اور مقدس کتابوں کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ اور آخری حصہ میں چٹگام کے 'پیر بدر کی، مدح و ثنا کی گئی ہے ۔ اس طول طویل دعائیہ نظم سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ بالکل علیحدہ کتاب ہے، اور''مقتول حسین،، نامی کتاب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔

یہ بھی بہت قابل غور بات ہے کہ اس کتاب میں شاعر نے کہیں بھی اپنے پیر و مرشد کا ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ طویل دعائیہ نظم میں تقریباً سب ہی مقدس اشیا' و ارواح کی مدح و ثنا کی گئی ہے ۔

اس کا موضوع کوئی نیا نہیں ھے بلکہ سبرید خاں کی ''حنیفہ اور کائراپری'' سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی گئی ھے - چٹگام کے جنوب میں جزیرہ ''شاہ پیر'' (اراکان کے قریب) ایک 'تانکی'، 'محمد حنیفہ اور کائرا پری' سے منسوب ھے - یہ پونتھی (عوامی نظم) بھی اسی قصے سے ماخوذ ھے - اس کتاب میں محمد حنیفہ اور کائراپری کی شادی کا واقعہ نظم کیا گیا ھے جو کہا جاتا کہ 'روکام' یا 'روکنہن' یا 'رو کھینک' میں ہوئی تھی -

(ج) '' اصحاب نامہ '' : اس کتاب کا کوئی قلمی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ھوا ھے - لیکن چاروں صحابہ کا ذکر شاعر نے ''قیامت نامہ'' میں کیا ھے - یہ کوئی نئی یا علیحدہ تصنیف نہیں بلکہ ''مقتول حسین'' ھی کا دوسرا باب ھے جسے علیحدہ نام دے دیا گیا ھے -

(د) ''مقتول حسین'' : یہ شاعر محمد خاں کی سب سے ضخیم کتاب ھے - چند سال پیشتر یہ کتاب کلکتہ میں '' بزندہ '' سے شایع کی گئی تھی لیکن وہ اڈیشن اب بہت کمیاب ھے اس میں واقعہ کربلا کے جانگداز واقعات بیان کئے گئے ھیں - محرم کے مہینے میں چٹگام میں یہ کتاب جگہ جگہ گھروں

میں اور باہر لوگ بلند آواز سے پڑھتے ہیں - یہ کتاب تاریخی نوعیت کی ہے اور اس میں بڑی تفصیل سے واقعات بیان کئے گئے ہیں لیکن اس کی بڑی خوبی شاعرانہ بلند خیالی ہے -

کتاب میں گیارہ بند ہیں اور خود شاعر کی پیش کی ہوئی منظوم فہرست کے مطابق حسب ذیل موضوعوں پر ہر بند مشتمل ہے :

پہلا بند — حضرت فاطمہ رض سے متعلق ہے (ادی)

دوسرا بند — اصحاب رض

تیسرا بند — حضرت امام حسن رض

چوتھا بند — حضرت مسلم رض

پانچواں بند — معرکۂ کربلا اور میدان کارزار

چھٹا بند — حضرت امام حسین رض

ساتواں بند — خواتین اور بیویوں سے متعلق (اسری)

آٹھواں بند — قاصد (" دؤبا ")

نواں بند — ولید

دسواں بند — یزید

گیارھواں بند — خاتمہ (انت)

قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۰۵٦ ہجری مطابق ۱۰٦۷ شکودا یا ۱٦۴۵ء میں لکھی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد خاں نے یہ کتاب تلسی رام داس کی ''مہابھارت'' (۱٦۴۵ء) کے جواب میں لکھی ہے۔ مہابھارت میں اٹھارہ بند ہیں ادی، سبھا، بارا، ورات، ادیوگ، بھیشم، ودونا، کرنا، شیلیا، سنپتکا، استری، شانتی، ان شاشن، اسومیدھ، آشرم، باس، مشل، مہاپرستان اور سرگرھن۔ ان میں سے ادی، اور استری، ایسے بند ہیں جو ''مقتول حسین'' میں بھی شامل ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں کی لکھی ہوئی بنگلہ کتابیں، مسلمان بھی بہت پڑھتے تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سید سلطان نے اپنی کتاب ''شب معراج'' کے دیباچے میں تحریر کیا ہے:

'' لشکر پراگل خاں کے حکم کی تعمیل میں
'' کویندرا نے مہابھارت کے قصے نظم کئے
'' یہ مظوم کہانیاں تمام ہندو اور مسلمان گھرانوں میں پڑھی جاتی تھیں
'' یہ کسی کو خیال نہیں آیا کہ خدا اور رسول صلعم کے متعلق بھی کچھ لکھنا چاہئے

عربی اور فارسی کتابیں،
' صرف پڑھے لکھے لوگ ھی سمجھ سکتے ھیں نہ کہ عوام
' اس افسوسناک حالت کو دیکھ کر مجھے مجبوراً
خیال آیا
کہ یہ کتاب لکھوں اور حضرت رسالت مآب صلعم
سے اسے منسوب کروں "۔

سید سلطان نے اپنے شاگرد (مرید) محمد خاں کو بھی
ھدایت کی کہ اس کام کا سلسلہ جاری رکھا جائے اور محمد
خاں نے اپنے خیالات کا اظہار "مقتول حسین" کے دیباچے
میں بھی کیا ھے اور ساری نظم اسی عزم و ارادے کی آئینہ دار
ھے ۔ غالباً شاعر محمد خاں ۱۶۴۵ء میں "مقتول حسین"
مکمل کرنے کے بعد زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکے ورنہ وہ
اسی اور کتابیں بھی لکھتے۔ ابتک تو ھم کو ان کی کسی
اور کتاب کا پتہ نہیں چل سکا ھے۔ اگر انکی عمر ستر برس
کی سمجھ لی جائے تو ان کا سن ولادت ۱۵۸۰ء کے قریب
ھوتا ھے۔

سید مرتضیٰ سترھویں صدی کے مسلمان شاعروں
۱۵۹۰ء تا ۱۶۶۲ء میں سید مرتضیٰ کی شہرت کئی
وجوہ پر مبنی ہے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں بنگال کی رائل عربک
سوسائٹی کے جریدے میں سید مرتضیٰ کے حالات پر ایک
مضمون شایع ہوا تھا۔ ایک ماھوار رسالہ ''سدھا،، میں' جو
اب نایاب ہے مسٹر نکھل ناتھ رے' مؤلف ''مرشدآباد
کہانی،، نے بھی ایک مضمون میں سید مرتضیٰ کے سوانح
پر کچھ روشنی ڈالی تھی۔

ان کا پورا نام سید مرتضیٰ آنند ہے' ان کے والد
سید حسن' بریلی کے رھنے والے تھے۔ ان کے پیر و مرشد کا
نام سید شاہ عبدالرزاق ہے۔ سید حسن مرشدآباد میں آ کر
آباد ھو گئے تھے اور سید مرتضیٰ اس شہر کے ایک قصبہ،
بالی گھاٹ (نزد جنگی پور) میں پیدا ھوئے۔

سید مرتضیٰ اپنے وقت کے ایک مشہور پیر تھے اور
اب بھی ان کا عرس تین روز تک ۱۱-۱۲، اور ۱۳ رجب
کو ھر سال جنگی پور پولیس اسٹیشن کے موضع سوتی میں منایا
جاتا ہے۔ سوتی ھی میں ان کا مزار ہے۔ شاہ نعمت اللہ
فیروز پوری (وفات ۱۶۶۴ء) جو سید سلطان (سید مرتضیٰ)

کے هم عصر تھے، ان کے بڑے دوست بھی تھے - چنانچه اب بھی جو درویش حضرات عرس کے موقع پر سونی میں سید سلطان کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں وہ وہاں سے فیروز پور جاکر شاہ نعمت اللہ کے مزار پر ضرور حاضری دیتے ہیں۔

سید سلطان پر موسیقی و لطف سماع سے ایک وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی - مفتی غلام حسین سرور لاہوری نے "خزینۃ الاصفیا"، میں لکھا ہے کہ ان کے بعض طریقے جوگیوں سے مماثل تھے - راج محل میں رہتے تھے اور صاحب کرامات تھے - توحید خداوندی کے گیت گاتے رہتے تھے - ان کا تخلص "آنند" انکی اس لطف و مستی کی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔

یقیناً ان کا وصال شاہ نعمت اللہ کی وفات سے پہلے ہی ہوا ورنہ درویش ان کے عرس میں شریک ہونے کے بعد شاہ نعمت اللہ کے مزار پر حاضری دینے نہ جاتے - اس طرح اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ان کی عمر ۷۰ یا ۷۲ سال کی ہوئی اور وہ سنہ ۱۶۶۲ء میں وفات پاگئے تو ان کا سنہ پیدائش ۱۵۹۰ء ہوتا ہے - اس زمانے کا ایک تاریخی

واقعہ بھی اسکی شہادت میں پیش کیا جاتا ہے - وہ یہ ہے کہ :

بالا گھاٹ کے ایک صاحب ' سید قاسم شاہ نے سنہ ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں ایک مسجد تعمیر کرائی - ان سید قاسم شاہ کی شادی سید مرتضیٰ کی پوتی سے ہوئی تھی - اب اگر پچیس برس کے حساب سے ہم تین پشتوں کا لحاظ کریں تو کل ۷۵ سال ہوتے ہیں - سید مرتضیٰ کے سال وفات سنہ ۱۶۶۲ء میں ۷۵ جوڑے جائیں تو سنہ ۱۷۳۷ء نکلتا ہے اور یہ تاریخ، مسجد کی تعمیر کی تاریخ، سنہ ۱۷۴۲ء سے بہت قریب پڑتی ہے - اس طرح انکی عمر کے متعلق کوئی زیادہ شبہ نہیں رہتا - سید مرتضیٰ صرف بنگلہ کے ہی شاعر نہ تھے بلکہ انہوں نے فارسی غزلیں بھی لکھی ہیں -

اب تک سید مرتضیٰ کی صرف دو بنگلہ کتابیں دستیاب ہوسکی ہیں :

۱— یوگ قلندر (جوگ قلندر)

۲— پداولی

'یوگ قلندر' بنگلہ زبان کے زندگی سے متعلق ادب میں بڑی خاص حیثیت رکھتی ہے - میں نے اس کتاب کو مرتب

کردیا ہے اور یہ راج شاہی کے '' ویرندرا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،، میں زیر اشاعت ہے - یہ '' مجمع البحرین ،، سے ملتی جلتی تالیف ہے۔ اس میں صرف ایک شعر ایسا ہے جسمیں شاعر نے تخلص استعمال کیا ہے :

''باپ میرے وجود کا باعث ہوا اور ماں نے دودھ
پلا کے پالا
سید مرتضیٰ زندگی (کے تعلقات) کی نزاکتیں
بیان کرنے چلا ہے،،

اس کتاب میں اسلامی معرفت اور ہندوانہ جوگ کے علوم کو بہت عجیب طور سے سمویا گیا ہے چنانچہ '' جوگ قلندر،، لوگوں میں بہت مقبول ہوئی - اس کتاب کے متعدد مخطوطات موجود ہیں - میری تالیف کے دوران میں نو مخطوطے پیش نظر رہے جن میں سے دو عربی رسم الخط میں تحریر ہیں - ضخامت کے اعتبار سے اسے کتاب نہیں کہا جاسکتا کیونکہ طباعت کے بعد شاید یہ ٦٠ یا ٧٠ صفحات پر مشتمل ہو - بعض اور شاعروں نے بھی '' جوگ قلندر ،، کے نام سے اسی قسم کی کچھ نظمیں لکھی ہیں لیکن یہ سب نظمیں سید مرتضیٰ کی '' جوگ قلندر ،، کی کسی نہ کسی طرح نقلیں ہی معلوم ہوتی ہیں -

سید مرتضیٰ کی ''یوگ قلندر'' اس جملہ سے شروع ہوتی ہے :-

''سب سے پہلے میں رب الارباب کی خدمت میں سر تعظیم خم کرتا ہوں اس کے بعد بارگاہ رسول پاک میں۔
خدائے رحمان و رحیم ' قوی و حی القیوم ہے ۔
اٹھارہ ہزار عالم اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں ''

سید مرتضیٰ کی ''یوگ قلندر'' کی پوری تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں - مثال کے طور پر فی الوقت صرف وہ اشعار پیش ہیں جو مقام ناسوت سے متعلق ہیں :

تیسرا (آسمان) ناسوت کا مقام ہے
اور عزرائیل فرشتہ یہاں متعین ہے
یہ ایک آگ کا عالم ہے
ایسی آگ جو کبھی بجھتی ہی نہیں !

مرتضیٰ شاہ کی دوسری تصنیف بنگلہ ''پداولی'' ہے۔ اب تک ان کے ۲۶ پد مختلف رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان کے علاوہ ہم کو بعض اور پدوں کا بھی پتہ چلا ہے۔ ان میں سے ایک پد ' وشنو داس کے '' پد کلا ترو '' میں (۲۹۰۷) موجود ہے ۔

نہ پد ' ہندوؤں کے لکھے ہوئے پدوں سے کم تر نہیں
ورنہ ایسے مجموعے یا انتخاب میں شامل نہ کیا جاتا ۔

شیخ مطلب: شیخ مطلب ابن شیخ پران ، سولھویں اور ستر ھویں صدی کے ممتاز شاعروں میں شمار ۱۵۹۰ء تا ۱۶۶۰ء
ہوتے ہیں ۔ ان کو بڑی مقبولیت حاصل تھی اور یہ ہردلعزیزی
غالبا ان کی مذہبی تصانیف کی وجہ سے تھی ۔ ان کی
تصنیف " کنایت المصلین" بہت مقبول ہوئی ۔ بنگلہ اور
عربی رسم الخط میں اس کتاب کے بہت سے قلمی نسخے دستیاب
ہوئے ہیں ۔ سب سے قدیم نسخے میں جو بنگلہ رسم الخط
میں ہے ۱۷۷۲ تاریخ ہے اور دوسرے نسخوں میں جو عربی
رسم الخط میں ہیں تاریخ ۱۸۱۸ء ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ اصل کتاب عربی رسم الخط میں نہیں لکھی گئی تھی ۔
یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور ۱۹۱ صفحے پر ختم ہوئی ہے ۔
دو نسخوں میں سنہ تصنیف رمز کے پیرائے میں دیا گیا ہے ۔
اعداد جوڑنے سے ۱۶۳۹ء یا ۱۰۴۹ھ دستیاب ہوتا ہے جس
سنہ میں کہ یہ کتاب مکمل ہوئی ۔

شیخ مطلب بارہ تیرہ سال کی عمر میں باپ کے سائے سے
محروم ہوگئے تھے اور انکی پرورش ایک بڑے دین دار بزرگ

مولوی رحمت اللہ نے کی۔ اُن ھی کے ساتھ یہ بہت عرصے تک رہے اور اُن کی ھی فرمائش پر ''کفایت المصلین'' لکھی۔ اس سلسلے میں شیخ مطلب لکھتے ھیں :

''مولوی رحمت اللہ ایک مشہور عالم ھیں

چشمۂ فیض و کرم ھیں، خوف و خطر کے خلاف اور نیکیوں کا گنجینہ

انہوں نے مجھے کھانا اور پہننے کے لئے کپڑا دیا

بڑی عنایتوں، مہربانیوں سے میری پرورش کی

وہ مجھے اپنے پاس بٹھایا کرتے تھے

اور کتابوں کا علم انھوں نے ھی مجھے سکھایا

میں نے ان کی فرمائش قبول کی

اور اُن کے قدم چھوئے

اور تمام اساتذہ کو سجدۂ تعظیم ادا کیا

اور پھر ''کفایت المصلین،، مکمل کی

میرا نام شیخ مطلب ھے، بیٹا ھوں مرحوم شیخ بران کا

جو سیتا کنڈ کے باشندے تھے''۔

شیخ مطلب، سیتا کنڈ کے رھنے والے اور بلا شبہ بڑے عالم فاضل آدمی تھے - اگرچہ مولوی رحمت اللہ اُن کے استاد

تھے لیکن ان کے پیر ایک اور بزرگ تھے - چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

”قدم بوس ہوں اپنے پیر سید حسن کا
اور ان کے بیٹے محمد شفیع کا“

یہ انکی ابتدائی تصنیف نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ایسی کتاب کم سنی میں مرتب نہیں کی جاسکتی غالباً شاعر نے ۴۲ یا ۴۳ سال کی عمر میں یہ کتاب مکمل کی ہے - اس کی روسے یہ کتاب ۱۶۳۸ء میں تکمیل کو پہنچی ہوگی - اس کے معنے یہ ہوئے کہ ان کا سن پیدائش ۱۵۹۵ کے لگ بھگ ہے - اگر ان کی عمر ۶۵ سال قیاس کرلی جائے تو ان کا سن وفات ۱۶۶۰ء ہوتا ہے - لہذا اغلباً انہوں نے عمر طبعی پائی تھی -

”کفایت المحسنین“ اسلامی فقہ کی کتاب ہے - فقہ کے یہ مسائل ہر مسلمان کے لئے جاننا ضروری ہیں - اسمیں مسلمانوں کی روز مرہ زندگی سے متعلق مسئلے ہیں جیسے مسائل روزہ ، مسائل نماز ، مسائل وضو وغیرہ - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر یہ کتاب پنجابی زبان میں لکھہ کر کچھ خوش نہیں کیونکہ اس کے لئے وہ کسی قدر معذرت کرتے

ھوئے لکھتے ھیں :

'' لوگ عربی زبان میں پوری طرح سمجھ نہیں پاتے
اس لئے میں نے مقامی بولی میں اسے لکھا
اور اسلامی فقہ بنگلہ زبان میں پیش کی ہے
اگرچہ میں محسوس کرتا ھوں کہ یہ مجھ سے بڑا گناہ
سرزد ھوا ھے
لیکن مجھے ایک یہ امید ھے کہ
مومن مجھے دعائیں دیں گے
اور اسطرح میرے گناہ دھل جائیں گے
اور خدا مجھے معاف کردے گا ''

اس بیان سے ثابت ھوتا ھے کے اس زمانے میں یہ ایک مسلمہ بات تھی کے بنگلہ زبان میں مذھب اسلام کی باتیں لکھنا یقیناً ایک بڑا گناہ کرنے کے مصداق تھا اور کثر مسلمان اس '' فتوے '' پر پورا اعتقاد رکھتے تھے ۔ شاعر نے بھی اس فتوے کو تسلیم کیا ھے اور یہ امید ظاھر کی ھے کے خدا اس کو معاف کردے ۔ کیونکہ نا واقف اور کم علم لوگ جب یہ کتاب پڑھیں گے تو اس کے لئے دعا کریں گے ۔

'' کفایت المصلین '' کے ایک قلمی نسخے میں بڑی

دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ پانچ بڑے بڑے پیغمبروں نے پانچ وقت کی نمازیں جاری کیں اور حضرت محمد صلعم نے ان کو سب پر فرض قرار دیا یعنی: فجر یا صبح کی نماز حضرت آدم ؑ نے شروع کی۔ ظہر کی نماز حضرت ابراھیم ؑ کے وقت سے شروع ہوئی۔ عصر کی نماز حضرت یونس ؑ نے اور مغرب کی نماز حضرت موسیٰ ؑ نے شروع کی۔

عشا کی نماز اور وتر حضرت محمد صلعم نے اضافہ فرمائے۔ شاعر "مطلب" کی ایک اور تصنیف "قاعدانی کتاب" بھی تھی۔ یہ اس وقت لکھی گئی تھی جب شاعر بہت کم سن تھا۔ اس میں جو کچھ لکھا گیا وہ شاعر نے اپنے پیر و مرشد حضرت فضل محمد سے حاصل کیا تھا۔ یہ بھی ایک مذہبی تصنیف ہے۔ شاعر نے اپنے تخلص کے ساتھ یہ شعر اس میں لکھا ہے:

ہیچمداں "مطلب" بارگاہ ایزدی سے مدد کا طالب ہے
اور چاہتا ہے کہ "قاعدانی کتاب" بندہ زبان میں لکھے"

سید محمد شفیع (۱۵۹۰ء تا ۱۶۶۵ء) یہ ہم پہلے ہی بیان کرچکے ہیں کہ سید محمد شفیع، ایک اور شاعر، حاجی محمد (۱۵۵۰ء تا ۱۶۲۰ء) کے شاگرد تھے۔

ابتک ہم کو ان کی تین کتابیں دستیاب ہوئی ہیں :
(۱) نور نامہ (۲) نور قندیل (۳) ساعت نامہ ان میں سے " نور نامہ "، اور " نور قندیل "، دراصل ایک ہی کتاب ہے اگرچہ نام مختلف ہیں۔ سارا متن ایک ہی ہے اگرچہ بعض جگہ غالباً کتابت کی غلطی سے عبارت کچھ کچھ بدل گئی ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ نام کون سا صحیح ہے؟ چونکہ زیادہ تر کتابوں پر " نور نامہ " ہی درج ہے لہذا ہم اسے " نور نامہ " ہی کہیں گے۔ لیکن جہاں دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے "نور ناموں" سے اس کو تمیز کرنا ہو تو اس کو " نور قندیل "، نام دے دیا جائیگا۔

شاعر کے والد کا نام شاہجہاں تھا۔ وہ ایک بزرگ آدمی تھے اور شہید ہوئے تھے۔ غالباً مذہب کے معاملے میں اپنی بے باکی کی وجہ سے، (اس زمانے میں درویش زیادہ تر مذہبی رسوم میں بے باک ہوا کرتے تھے)، شہید کردیئے گئے تھے۔ انہوں نے ہی شاعر کو تصوف و معرفت کی راہ پر لگایا تھا۔ شاعر کا اپنا کلام اسکی تصدیق کرتا ہے :-

" محمد شفیع کہتا ہے کہ وہ بہت رنجیدہ ہے کیونکہ اس دنیا میں بھی دوسروں کی محبت کے سہارے جینا اور دوسرے جہان

میں بھی اسی پر انحصار !

"میرے باپ کا نام شاھجہاں تھا - وہ جو بزرگ تھے اور شہید ہوئے - انھوں نے ھی مجھے اس راہ (معرفت) پر لگایا تھا"

ابتک ان کی تصنیف کے کسی نسخے پر کوئی تاریخ نہیں ملی - ہم کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ حاجی محمد کے شاگرد تھے جن کا زمانہ ۱۵۵۰ء سے ۱۶۲۰ء تک ہے - لہذا ہم صرف قیاس کرسکتے ھیں کہ شاعر کا زمانہ ۱۵۹۵ء سے ۱۶۶۵ تک کا ھے گویا ان کی عمر ۷۰ برس کے قریب ہوئی -

اس نظم کا مضمون اس طرح ہے کہ شاعرنے نظم کی ابتدا بعثت نور محمدی کے بیان سے کی ہے - پھر بتایا ہے کہ جنت ، دوزخ ، زمین اور کل کائنات اسی نور سے پیدا ہوئی - یہ سب بیان کرتے کرتے وہ مسلمانوں کیلئے ھدایتیں بھی کرتا جاتا ھے -

شاعر کی دوسری تصنیف "ساعت نامہ" ہے - اس چھوٹی سی کتاب میں سعد و نحس اوقات بتائے گئے ھیں -

عبدالحکیم شاعر عبدالحکیم نے بہت سی کتابیں (۱۶۲۰ء تا ۱۶۹۰ء) لکھی ھیں - وہ "سندویپ" کے قصبہ

سدھارام میں پیدا ھوئے تھے ان کے والد کا نام عبدالرزاق تھا۔ اور شاعری میں ان کے استاد شہاب الدین محمد تھے۔ ان کی تصنیفوں کے قلمی نسخے تریپورہ سے لیکر چٹگام تک کے علاقے میں دستیاب ھوئے ھیں۔ اس سے اس شاعر کی مقبولیت کا اندازہ ھوتا ھے۔ ان کی تصنیف ''لال متی سیف الملک،، کو بڑتله نے شایع کیا۔ بنگال میں یه کتاب انیسویں صدی میں عام مقبولیت حاصل کرچکی تھی۔

ان کی تصنیفوں کے قلمی نسخوں سے تاریخوں کا کوئی پته نہیں چلتا، تاھم حسب ذیل باتوں کو پیش نظر رکھ کر هم اُن کے متعلق کچھ تاریخیں فراھم کرسکتے ھیں:

۱- اُن کی ایک تصنیف ''شہاب الدین نامه،، کا قلمی نسخه جو باقر گنج میں میں ھے اس کے ایک صفحه پر تاریخ کتاب درج ھے اور یه تاریخ سنه ۱۱۴۲ بنگلی سال کی ھے، جو سنه ۱۷۳۵ء کے مطابق ھوتا ھے۔ (۱۱۴۲ بنگلی سال ھی ھوگا کیونکه باقر گنج میں کوئی اور سنه رائج نہیں تھا)۔ بہرحال اس سے پته چلتا ھے کے شاعر اٹھارھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں حیات تھا۔ اکثر نسخے خود مصنف کی حیات ھی میں مرتب کئے اور لکھے جاتے رھے لیکن یه نسخه انکی حیات

میں نہیں لکھا گیا ہے - اس کا ثبوت اور چند باتوں سے
بھی ملتا ہے -

۲- اُن کی تصنیف ''لال متی سیف الملک'' کا قلمی نسخہ
جو تری پورہ میں ملا ہے اس پر تری پورہ کا سنہ ۱۲۶۷
درج ہے جو سنہ ۱۸۵۷ء کے مطابق ہوتا ہے - بعض اور
نسخوں میں تخلص کے طور پر جو نام دیا گیا ہے اس میں شاعر
کا نام اور تخلص کے ساتھ ''شریف'' بھی لکھا ہے - ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ یہ ''شریف'' کوئی ایسا شخص تھا جس نے
ان کی کئی اور تصنیفوں کی کتابت کی تھی - ایک جگہ وہ
خود اپنے متعلق لکھتا ہے :

''میرے باپ کا نام قاضی منصور ہے جو شاہ سلطان
کے بیٹے تھے ' وہ شاہ سلطان جو خوبیوں اور نیکیوں کا مجموعہ
تھے'' - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شریف شاہ یا شاہ شریف
ہمارے ایک اور ممتاز شاعر سید سلطان کے پوتے تھے -
اور شاعر سید سلطان کی عمر بہت بڑی ہوئی - وہ سنہ [illegible]
میں زندہ تھے - [illegible] محمد خاں کے سوانح حیات میں بھی [illegible]
ہے - اگر سید سلطان اور ان کے پوتے کے زمانے میں پچاس
برس کا زمانہ فرض کر لیا جائے تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ

شاہ شریف نے شاعر عبدالحکیم کی تصنیفوں کے قلمی نسخوں کی کتابت سنہ ۱۶۴۶ء کے ۵۰ سال بعد یعنی سنہ ۱۶۹۶ء میں کی تھی - اور اغلبا شاعر عبدالحکیم سترھویں صدی کے شاعر تھے -

بعض دیگر شہادتوں سے بھی یہ اندازہ ھوتا ھے کہ وہ سترھویں صدی سے پہلے کے شاعر ھیں - وہ سندویپ کے رھنے والے تھے اور اگر وہ شروع سترھویں صدی کے آدمی ھوتے تو پھر وہ پرتگالیوں کا تذکرہ نہیں کرسکتے تھے جن کے حکمراں گنجالیس نے سنہ ۱۶۰۹ء میں سندویپ فتح کیا تھا اور پھر چٹگام کے راجہ نے پرتگالی حکمراں کو ۱۶۰۹ء میں مار بھگایا تھا - اس سے پہلے فتح خاں سنہ ۱۶۰۴ء تا سنہ ۱۶۰۹ء تک سندویپ کا حکمراں تھا - ایک اور شاعر نصراللہ خاں (سنہ ۱۵۶۰ء تا سنہ ۱۶۲۴ء) نے فتح خاں کا ذکر کیا ھے - پھر عبدالحکیم نے پرتگالیوں کا ذکر ھی نہیں کیا ھے اور نہ انھوں نے اراکانیوں اور روزنگیوں اور فتح خاں کا کوئی ذکر کیا ھے - یہ بڑی عجیب بات ھے کہ ایک ایسا شاعر اپنے عہد میں ھونے والے چٹگام کے ان واقعات کا کوئی ذکر نہ کرے - اس سے یہی ثابت ھوتا

ہے کہ یا تو شاعر کا زمانہ ۱۶۰۰ء سے پہلے کا تھا یا ۱۶۲۰ء کے بعد کا۔ کوئی قطعی تاریخی مواد موجود نہ ہونے کی صورت میں ہم اس شاعر کا زمانہ ۱۶۲۰ء سے ۱۶۹۰ء تک کا مانے لیتے ہیں۔

شاعر کے لئے یہ زمانہ معین کرنے میں ہم کو اس واقعہ سے بھی مدد ملتی ہے کہ اس زمانہ میں تمام مسلمان شاعروں نے بنگلہ زبان میں مذہبی موضوعوں پر نظمیں لکھنے کے بعد کوئی نہ کوئی معذرت کی ہے۔ سید سلطان، نصراللہ خاں، محمد خاں حاجی محمد، شیخ مطلب، ان میں سے ہر ایک کو بنگلہ زبان کے ذریعے تبلیغ اسلام کرنے میں دقتیں پیش آئیں۔ سید سلطان کو تو "فریبی"، اور "سیاہ کار" تک کہدیا گیا۔ اس زمانے میں قدامت پسند طبقے نے ایک تحریک شروع کردی تھی جس کا مقصد اس بات کی مخالفت تھا کہ ہندوؤں کی زبان میں اسلام کی باتیں بیان کی جائیں۔ شاعر عبدالحکیم کے زمانے میں یہ تحریک اپنے پورے شباب پر تھی ورنہ شاعر نے اپنے مخالفوں کے لئے ایسے سخت لفظ استعمال نہ کئے ہوتے جیسے کہ حسب ذیل نظم میں ملتے ہیں:

"میں بنگلہ زبان میں لکھتا رہا ہوں

میری کوشش یہ ہے کہ محنت کر کے سب کو
خوش کروں
مجھے عربی یا فارسی سے بیر نہیں ہے
کیونکہ لوگ تو مقامی بولی ہی سمجھتے ہیں
کوئی بات عربی، فارسی یا ہندی میں کہی جائے تو
مضمون میں فرق نہیں آجاتا
بالخصوص جب وہ بات خدا اور اس کے رسول کے
مناقب سے متعلق ہو
خدا اپنے سب بندوں کی بولی سمجھتا ہے
وہ ہندوؤں کی زبان سے بھی واقف ہے
اور بنگالیوں کی زبان بھی سمجھتا ہے
مجھے ان لوگوں کی ولدیت میں شبہ معلوم ہوتا ہے
جو پیدا تو بنگال میں ہوئے اور بنگلہ زبان سے نفرت
کرتے ہیں
اگر وہ مقامی زبان نہیں سیکھنا چاہتے
تو وہ کیوں نہیں اس ملک کو چھوڑ کر کسی
دوسرے دیس میں چلے جاتے
ان کے والدین اور آبا و اجداد بنگال میں رہے

یقیناً بنگلہ زبان کے ذریعے تبلیغ کا اخلاقی اثر
زیادہ ہوتا ہے"۔ ("نور نامہ")

مندرجہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کے زمانے میں بنگلہ کے خلاف تحریک کا زور مدھم پڑ گیا تھا اور جو لوگ اسکی تائید میں تھے کہ بنگلہ زبان کے ذریعے مذھب کی تبلیغ کی جائے انکو پوری کامیابی اگر نہ بھی ہوئی تب بھی یہ ظاھر ہوتا ہے کہ زمانہ کا اثر بہت بڑھ گیا تھا، ورنہ ان کے مخالف لوگوں کو " مجہول النسب " ایسے سخت الفاظ سے یاد کرنے کے بعد شاید شاعر زندہ نہ بچ سکتا۔

ان ھی باتوں سے ھم اس نتیجہ پر پہنچتے ھیں کہ اس شاعر کی تصنیفیں سترھویں صدی کے آخر کی پیداوار ھیں۔

یہ تو ھم بتاچکے ھیں کہ شاعر عبدالحکیم نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ھیں۔ ان میں سے حسب ذیل دستیاب ہوسکی ھیں:

۱ - یوسف زلیخا
۲ - لال متی سیف الملک
۳ - شہاب الدین نامہ
۴ - نور نامہ

میری کوشش یہ ھے کہ محنت کر کے سب کو
خوش کروں
مجھے عربی یا فارسی سے بیر نہیں ھے
کیونکہ لوگ تو مقامی بولی ھی سمجھتے ھیں
کوئی بات عربی، فارسی یا ھندی میں کہی جائے تو
مضمون میں فرق نہیں آجاتا
بالخصوص جب وہ بات خدا اور اس کے رسول کے
مناقب سے متعلق ھو
خدا اپنے سب بندوں کی بولی سمجھتا ھے
وہ ھندوؤں کی زبان سے بھی واقف ھے
اور بنگالیوں کی زبان بھی سمجھتا ھے
مجھے اُن لوگوں کی ولدیت میں شبہ معلوم ھوتا ھے
جو پیدا تو بنگال میں ھوئے اور بنگلہ زبان سے نفرت
کرتے ھیں
اگر وہ مقامی زبان نہیں سیکھنا چاھتے
تو وہ کیوں نہیں اس ملک کو چھوڑ کر کسی
دوسرے دیس میں چلے جاتے
اُن کے والدین اور آبا و اجداد بنگال میں رھے

یقیناً بنگلہ زبان کے ذریعے تبلیغ کا اخلاقی اثر
زیادہ ہوتا ہے"۔ ("نور نامہ")

مندرجہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کے زمانے میں بنگلہ کے خلاف تحریک کا زور مدھم پڑ گیا تھا اور جو لوگ اسکی تائید میں تھے کہ بنگلہ زبان کے ذریعے مذہب کی تبلیغ کی جائے انکو پوری کامیابی اگر نہ بھی ہوئی تب بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ کا اثر بہت بڑھ گیا تھا، ورنہ ان کے مخالف لوگوں کو "مجہول النسب" ایسے سخت الفاظ سے یاد کرنے کے بعد شاید شاعر زندہ نہ بچ سکتا۔

ان ہی باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس شاعر کی تصنیفیں سترھویں صدی کے آخر کی پیداوار ہیں۔

یہ تو ہم بتاچکے ہیں کہ شاعر عبدالحکیم نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل دستیاب ہوسکی ہیں :

۱ - یوسف زلیخا
۲ - لال متی سیف الملک
۳ - شہاب الدین نامہ
۴ - نور نامہ

۵ - نصیحت نامہ (میں نے یہ نسخہ نہیں دیکھا)

۶ - چار مقام بھید

۷ - کار والا

۸ - شاہ نامہ (سحر نامہ)

پروفیسر علی احمد نے اپنی کتاب "پنجابی کلاں دا ہیر وارث" میں آخری دونوں کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ مجھے ان میں سے کسی کو خود دیکھنے کی سعادت نہیں نصیب ہوئی۔

اتنی بہت سی کتابوں کا تفصیلی تعارف تو ممکن نہیں لہذا میں ان میں سے چند کا مختصر تعارف کراتا ہوں۔

۱ - "یوسف زلیخا" یہ ایک طویل بیانیہ نظم ہے انجیل، و قرآن شریف میں مذکور اور فردوسی اور جامی کے لکھے ہوئے مشہور واقعات سب کو معلوم ہیں، وہی اس نظم کا موضوع ہے - یعنی حضرت یوسف اور زلیخا (زوجہ بادشاہ مصر) کی داستان محبت اور انجیل میں حضرت یوسف کو "جوزف" اور ان کے والد حضرت یعقوب کو "جیکب" کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔

شاعر نے لکھا ہے کہ اس نظم کو لکھنے سے پہلے اس نے اپنے پیر شہاب الدین قمر سے بذریعہ مراقبہ کسب فیض کیا اور اسکی صورت یہ ہوا کرتی تھی کہ میں نے پیر کے دو "صندلوں"

پر غور و فکر کیا کرتا تھا ،، ۔

نظم میں بعض جگہ اصحاب داستان کا کردار بہت اچھے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے ۔ اس نظم میں جگہ جگہ فارسی ادب کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں ۔

''لال متی سیف الملک'' : یہ بھی ایک پابند نظم ہے ۔ اس میں سکندر کے بیٹے سیف الملک اور ایک مقامی شہزادی لال متی کی محبت اور شادی کی داستان ہے ۔ یہ کتاب بڑا عرصہ سے چند سال ہوئے شائع ہوکر عوام میں اچھی طرح متعارف ہو چکی ہے ۔ یہ نظم بھی پیر شہاب الدین سے معنون کی گئی ہے ۔ ''لال متی سیف الملک،، کا ایک ایسا نسخہ بھی دستیاب ہوا ہے جو شاہ شریف سے منسوب ہے جو شاعر عبدالحکیم کی نظموں کا کاتب ہے اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں ممکن ہے اس نے اپنی نظم کی کم مائگی کا احساس کر کے عبدالحکیم کی نظم کی کتابت کرتے کرتے اس میں اپنا ایک مقطعہ جوڑ کر نظم کو اپنی تصنیف بنا کر پیش کردیا ہو ۔

''شہاب الدین نامہ'' : یہ ۱۴۵ صفحہ کی مذہبی مسئلے مسائل کی کتاب ہے ۔ اسکی کتابت باقر گنج میں سنہ ۱۷۳۵ میں ہوئی ۔ بنگلہ زبان میں مذہب سے متعلق ایسی اچھی کتابیں

بہت کم یاب ہیں۔ اس کتاب میں انسان کو گمراہی سے بچانے اور راہ راست پر چلنے کی تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ یہ شاعر کے پیر جناب شہاب الدین کی سوانح عمری نہیں ہے اور نہ اس میں ان کی ہدایات وملفوظات درج ہیں۔ بلکہ صرف ان سے معنون کی گئی ہے۔

"میں نے اس کتاب کا نام اپنے پیر کے نام پر رکھا۔
جو کوئی اسے پڑھے گا وہ نیکیوں کی نعمتوں سے
مالامال ہوگا"

شاعر عبدالحکیم نے تینوں زبانوں، عربی، فارسی اور بنگالہ کے متعلق ایک دلچسپ رائے زنی کی ہے۔ کہتے ہیں:

"عربی سیکھو اور مذہبی معلومات حاصل کرو
سارے علموں میں عربی زبان کا علم سب پر فائق ہے
اگر تم عربی نہ سیکھ سکتے ہو تو
فارسی پڑھو۔ تم کو معلوم ہوگا کہ نجات بعدالممات
کے لئے کیا کرنا چاہیئے
اگر تم فارسی نہ سمجھ سکتے ہو
تو اپنے مذہب کے متعلق اپنی مقامی زبان ہی میں معلومات
حاصل کرو

عربی زبان کا علم ، مذہب اسلام کے علم کے مرادف ہے
عربی کا علم تمام علوم پر فوقیت رکھتا ہے
فارسی زبان عربی زبان کی بہن ہے
یہ اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے
ہندوؤں کی مذہبی کتابیں فارسی مذہبی کتابوں سے نکلی ہیں
میں نے فارسی ہی سے کسب فیض کیا ہے
جس شخص کو ان تینوں زبانوں میں سے کوئی بھی
نہیں آتی وہ
یقیناً اندھیرے میں ہے
اولاد آدم کے لئے یہ ضروری ہے کہ علم حاصل کرے
کیونکہ علم کے بغیر مالک حقیقی کو نہیں پہچانا
جاسکتا ۔

" نور نامہ " : اس پر مکرر تفصیلی بحث لا حاصل ہے ۔ اس کا موضوع بھی تقریباً وہی ہے جو مندرجہ بالا تصنیف کا ہے ۔ اس کتاب کے آخر میں جو دعا مانگی گئی ہے ، وہ بے شک درج کرنے کے لائق ہے :

" عبد الحکیم شاہ ، بیٹا عبد الرزاق کا ، بارگاہ خداوند تعالیٰ میں بصد عجز دست بدعا ہے کہ اے خدائے برتر ،

کہ تخلیق کائنات کا سبب اولیٰ ہے ، اے خدائے برتر ، کہ نہ جس کی ابتدا ہے نہ انتہا ، رسول کریم محمد مصطفیٰ صلعم کے طفیل ، مجھے توفیق دے کہ روز قیامت شرمسار نہ اٹھوں - میری دعائیں قبول فرما اور ان سب کی جو امت محمدی میں ہیں ” -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کے لکھنے سے شاعر کا مقصد یہ تھا کہ روز جزا ، سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلعم کی دست گیری و پناہ اسے نصیب ہو -

نصیحت نامہ : میں نے خود ابھی تک اس کا کوئی نسخہ نہیں دیکھا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ ”شہاب الدین نامہ“ کا دوسرا متن ہے - اب معلوم ہوتا ہے - کہ کتاب کا اصل نام یہی تھا اور پھر اس کتاب کو اپنے پیر کے نام معنون کرنے کے بعد اس کا نام ” شہاب الدین نامہ “ رکھ دیا گیا - دونوں کا موضوع اور متن بالکل ایک ہی ہے -

باب چہارم

عہد مغلیہ کے چند اور شعرا

(۱۶۰۰ء تا ۱۷۰۷ء)

تصانیف کا تجزیہ

عہد مغلیہ میں شاعروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں تفصیل سے کچھ لکھنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہاں اختصار سے ہی کام لے رہے ہیں۔ ابتدا ہی میں یہ بتادینا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر شعرا اراکان اور تپرہ کی خود مختار ریاستوں میں گذرے ہیں۔ لہذا ان کا شمار بنگالی شعرا میں نہیں کرنا چاہئے۔ ان میں سے چند شعرا پر ہم اپنی کتاب "اراکان راج سبھائے بنگلہ ساھتیہ" (اراکان کے شاہی دربار میں بنگالی ادب) میں بحث کرچکے ہیں۔

نوازش خاں: آپ سات کنیا تھانہ کے ڈوں ملکم چاری، (چاٹگام) کے باشندہ تھے۔ عطاء اللہ خاں نے جو ان

کی اولاد میں ہیں اطلاع دی ہے کہ یہ شاعر بنگالی سن ایک
ہزار ماگھی یا ۱۶۳۸ء میں حیات تھے - اور ان دنوں جوان
تھے - ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں :-

(الف) "پٹھان پر اسنگشا" یا (پٹھان کی مدح سرائی) :
"سات کنیا" بستی میں جو پٹھان خاندان گزرا ہے اس کتاب میں اسی
خاندان کے قیام کی مدح سرائی کی گئی ہے - یہ خاندان
آج بھی "آدھو خان" کے نام سے مشہور ہے -

(ب) "گل بکاؤلی" : یہ کتاب ودیاناتھ رائے کی
درخواست پر لکھی گئی تھی ودیا ناتھ رائے کا تعلق بانی گرام
کے زمیندار خاندان سے تھا - اس کتاب میں جو خود نوشت
تفصیلات دی گئی ہیں ان سے ہمیں شاعر کا حسب ذیل
خاندانی شجرہ ملتا ہے :-

سلیم خاں — سلیم پور پرگنہ کے بانی
|
شریف خاں
|
ابراہیم خاں
|
محمد یار خاں
|
محمد نوازش خاں (شاعر)

گل بکاؤلی بیانیہ نظم ہے - اس کی کہانی یوں شروع
ہوتی ہے :-

"تاج الملک شکستان کا شہزادہ تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر باشاہ کی بصارت ضائع ہوگئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اگر پری بکاؤلی کے باغ کے پھول کا رس آنکھوں میں ٹپکایا جائے تو باشاہ کی بینائی واپس آسکتی ہے۔ چنانچہ بادشاہ بکاؤلی کے ملک میں گیا اور پھول کے بدلے میں پری کو ہار اور انگشتری دے کر اپنی سلطنت میں واپس لے آیا۔ ایک مدت کے بعد پری نے تاج الملک کو ڈھونڈ نکالا اور پھر دونوں کی شادی ہوگئی"۔

نوازش خاں کے اچھے شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

(ج) "جرواڑ سنگھ کیرتی" (زوآور سنگھ کے کارنامے) :

حاکم میں "میربو سرائے خانہ" ہے جہاں جرواڑ سنگھ نامی مشہور جگہ ہے۔ اس ضلع کے دو ہزاری علاقے میں دو خاندان حکومت کرتے تھے: ایک ہزاری خاندان اور دوسرا جرواڑ سنگھ خاندان۔ اس کتاب میں ان ہی کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔

(د) "بیانات" : اس کتاب کا اصل نام ہمیں نہیں مل سکا۔ چونکہ یہ چند مذہبی موضوعات کا مجموعہ ہے اسلئے ہم نے اس کا نام "بیانات" رکھ دیا ہے۔ پہلے "بیان" میں انسان اور اس کے جسم کے درمیان معرکہ دکھایا گیا ہے۔ دوسرے "بیان"

میں ریا کاری کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے -

(س) "گیتا بالی": نوازش خاں نے بکثرت گیت لکھے ہیں جن میں سے ابتک تین مجموعوں کا پتہ چل سکا ہے -

قمر علی : "پتیاتھانہ" کے گاؤں کارو ڈانگا (چاٹگام) کے باشندے تھے - آپ کو موسیقی میں بھی خاصا درک تھا - فارسی بھی اچھی جانتے تھے - اس گاؤں میں آپ ماہر موسیقی کے نام سے مشہور تھے اور نیچی ذات کے ہندو ان سے گانا سیکھا بھی کرتے تھے - ابتک ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کا پتہ چلا ہے :- (الف) "سرسالیر نیتی" (ب) "ریتور بارہ ماس" (ج) "پداولی" -

انہوں نے منعم مسلم نامی ایک عالم اور فاضل شخص کی ہدایات کے مطابق "سر سالیرنیتی" تصنیف کی - یہ دراصل فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے کیونکہ انہوں نے خود لکھا ہے :

"واضح رہے یہ فارسی تصنیف تھی لیکن میں نے بنگالی میں اس کا ترجمہ اسلئے کیا تھا کہ آسانی سے سب کی سمجھ میں آجائے" -

اس میں مسلمانوں کے روز مرہ قوانین اخلاق زیر بحث

آتے ہیں ۔ قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۶۷۵ء میں مکمل ہوئی ۔

(ب) " ریتور بارہ ماس " : جب شری کرشن متھرا گئے اور سال کے چھ مہینے رادھا کو جدائی کی آگ میں جلنا پڑا تو اسی جدائی کا نقشہ اس مختصر کتاب میں کھینچا گیا ہے ۔ برہ کی ماری رادھا کے جذبات کی عکاسی بہت واضح طور پر کی گئی ہے ۔

شاعر کو پدا ولی میں بھی کافی مہارت حاصل تھی ۔ ابتک ان کے صرف پندرہ پدوں کا پتہ چلا ہے ۔ یہ "برج سندر سانیال" کی ترتیب دی ہوئی کتاب " مسلم و شنام کوی " میں محفوظ ہیں ۔

منگل چاند : اگرچہ یہ نام ذرا عجیب سا ہے لیکن یہ شاعر مسلمان ہیں ۔ " شاہ جلال مدھو مالا " ان کی تصنیف ہے ۔ ان کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ۱۶۶۵ء میں لکھی گئی ۔ شاعر نے اس کتاب کے ذریعہ اسلامی معرفت کا پرچار کیا ہے ۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ شاعر ضلع نبھرہ کے رہنے والے تھے ۔

عبدالنبی : چاٹگام میں ایک گاؤں چیل بور ہے۔ یہ اسی گاؤں کے ایک صدیقی خاندان میں پیدا ہوئے۔ شاعر مقیم نے چاٹگام کے ابتدائی شاعروں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس میں بھی ان کا نام ہے۔ ''امیر نامہ'' کے علاوہ ان کی کسی دوسری تصنیف کا پتہ نہیں لگا۔ قطعۂ تاریخ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ''امیر نامہ'' ۱۰۹٦ھ مطابق ۱٦٨۵ء میں لکھی گئی۔ اس کا رسالہ فارسی تصنیف ''داستان امیر حمزہ'' سے ماخوذ ہے چنانچہ شاعر نے خود لکھا ہے :-

''لوگوں کو بڑی پریشانی تھی کیونکہ
سارے بنگالیوں کو فارسی نہیں آتی تھی
بعض تو سمجھ لیتے تھے، بعض نہیں سمجھتے تھے
اس لئے میں نے بنگلہ زبان میں اسے لکھنے کا فیصلہ کیا
اس کہانی کا تعلق ایک مسلمان سے ہے اسلئے میں ڈرا
کہ کہیں خدا مجھ سے خفا نہ ہو جائے کہ میں نے
بنگلہ زبان میں یہ کہانی کیوں لکھی
لیکن عوام کو چونکہ اس کہانی سے فائدہ پہنچ سکتا تھا
تھا اسلئے میں نے بےڈر ہو کر لکھنے کا فیصلہ کر ہی لیا''

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سترھویں صدی کے اواخر میں بھی بنگالی زبان کے استعمال پر ''خدا کی ناراضگی کا خوف'' لوگوں کے دلوں پر طاری تھا۔

محمد فصیح : اب تک اس شاعر پر کسی نقاد نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ گمنامی کے پردے میں ہے۔ حالانکہ یہ بھی اپنے عہد کا ایک بڑا شاعر ہے۔

اب تک ان کے لکھے ہوئے ایک کتابچہ ''مناجات'' کا ہی پتہ چل سکا ہے۔ جو ۲۶ صفحات پہ مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر گیارہ اشعار ہیں۔ بنگالی سال ۲۶۔ اساڑھ ۱۲۲۲ء میں اسے نقل کیا گیا۔ یہ کتابچہ کئی لحاظ سے ممتاز ہے۔ اول تو تمہید سے بالکل مبرا ہے۔ شاعر نے صرف عربی رباعیاں لکھی ہیں جو بنگلہ رسم الخط میں ہیں۔ دوسری خصوصیت اس کا اختتامیہ ہے۔ مناجات کے اختتام پر 'حمد' اور 'نعت' بھی شامل ہیں۔ اس میں بھی شاعر نے روایت سے بغاوت کی ہے۔ تیسری خصوصیت زیادہ قابل توجہ ہے۔ مناجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پہلے ماہر لسانیات ہیں جنہوں نے لسانیات کے علم کو عربی سے بنگالی میں منتقل کیا۔

مرحوم مولوی عبدالکریم ''ساهینه و شارد'' نے ''قدیم

بنگالی پوتھی،، میں (جو اب تک مسودے کی ھی حالت میں ھے)
لکھا ھے کہ ' مناجات ' بنگالی سال ۱۰۵۷ مطابق ۱۶۹۵ء
میں لکھی گئی تھی - مگر انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ھے تاھم
ان کے پاس یقیناً کوئی ثبوت ضرور ھوگا - البتہ یہ بھی ھو سکتا ھے
کہ مولوی صاحب نے جو تاریخ بتائی ھے وہ تصنیف کی نہ ھو نقل
کرنے کی تاریخ ھو، ورنہ وہ کسی شعر کا حوالہ ضرور دیتے-

ھمارا خیال ھے کہ محمد فصیح بلا شبہ آخری دور کے
شاعر ھیں - اپنے اُستاد کا ذکر کرتے ھوئے وہ لکھتے ھیں :
'' حضرت میر '' سیر تان کے پائے مبارک پر وغیرہ - نقل
نویس نے یقینا ''شرسرتان،،' کو غلطی سے ''سیرتان،،' لکھدیا
ھے -''شرسرتان،، کامطلب ھے ''سر کا لباس،،- لہذا اس جملے کا
مطلب یہ ھوتا ھے '' حضرت میر شاعرالشعراء کے پائے مبارک
پر'' اور اگر لفظ سیرتان واقعی' سلطان کی بگڑی ھوئی شکل
''سرتان،، ھے تومطلب یہ ھوتا ھے :- '' شاعر نے شاعر سلطان
(سید سلطان) کے پائے مبارک پر اپنا سر رکھا ھے،، - اور بھی
زیادہ صاف اور معقول مطلب معلوم ھوتا ھے - اس لحاظ سے غالباً
محمد فصیح سید سلطان (درویش شاعر) کے شاگرد تھے اور اس
طرح محمد خاں کے ھم عصر ھوئے اور ۱۶۱۰ء سے ۱۶۸۰ء

تک حیات تھے - آستاد اور شاگرد کے زمانے میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے - ایسی صورت میں محمد فصیح ۲۵ سال پہلے گذرے ہونگے -

'مناجات' ایک اچھی تصنیف ہے - باد الہیٰ کی اتنی اچھی مثال نہیں مل سکتی - ہر شعر ہیرے کی طرح روشن ہے-

محمد جان : آپ اٹھارویں صدی کے آخری دور کے معلوم ہوتے ہیں - ان کے ایک ہی کتابچے 'نماز نامہ' کا پتہ چل سکا ہے - جس کے مسودے پر ۱۲۱۴ ماگھی یا ۱۸۵۲ء درج ہے - بہت ممکن ہے شاعر تقریبا ایک صدی پہلے موجود ہوں - آپ کا مسودہ عربی رسم الخط میں لکھا ہوا ہے کہتے ہیں :

"رفیقو میری ایک اور بات سن لو

میں عربی رسم الخط میں بنگلی لکھ رہا ہوں !

جو شخص دیدہ و دانستہ گناہ کرے وہ گناہ عظیم

کا مرتکب ہوتا ہے- یعنی اتنا بڑا گناہ جیسا کہ

رسول کو قتل کرنا" -

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی بنگالی رسم الخط میں مذہبی باتوں کا پرچار کرنا گناہ تصور کیا جاتا تھا ۔

فقیر غریب اللہ : آپ ھگلی (صوبہ مغربی بنگال) کے رہنے والے تھے ۔ آپ کی تصنیفات میں ''یوسف زلیخا''،(ب)''راست پیر'' اور (ج) ''مقتول حسین''یا'' جنگ نامہ'' (نامکمل) شامل ہیں۔ ان پر تاریخ درج نہیں ہے ۔ ان کے نامکمل 'جنگی نامہ' کو ایک اور شاعر محمد یعقوب نے مکمل کیا۔ اس میں تاریخ درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ غریب اللہ سترھویں صدی میں گذرے ہیں ۔ ان کے والد کا نام شاہ ڈنڈی تھا۔

محمد یعقوب : آپ بشیر ھاٹ' چوبیس پرگنہ سب ڈویژن کے موضع' ذکرپور' کے رہنے والے تھے' لیکن چند نامعلوم اسباب کی بنا پر آپ نے بلیہ سب ڈویژن '(ھگلی)' میں زندگی بسر کی ۔ غریب اللہ کی نامکمل تصنیف 'جنگ نامہ' کو انہوں نے مکمل کیا۔ زیادہ حصہ ان ہی کا لکھا ہوا ہے ۔ کتاب کے اختتام پر یعقوب نے تصنیف کی تاریخ بھی درج کی ہے' یعنی ۱۶۹۴ء۔

''جنگ نامہ'' ایک ضخیم کتاب ہے۔ شاعر کہتا ہے:

''فارسی میں 'مقتول حسین' کے نام سے ایک کتاب ہے۔
اسی نمونے پر میں نے 'جنگ نامہ' لکھی ہے''۔

شیخ منصور آپ چاٹگام کے شاعر ہیں۔ ان کی نظم کا عنوان ہے ''سر نامہ'' جو فارسی نظم 'اسرارالموسیٰ' کا خلاصہ ہے۔ شاعر نے ابتدا ہی میں اس کا اظہار کر دیا ہے۔ انہوں نے تصنیف کی تاریخ ۱۷۰۳ء لکھی ہے۔ آپ کا تعلق ایک شیخ خاندان سے تھا اور شغل کے لحاظ سے ان کے والد ایک پیر تھے جن کا نام قاضی عیسیٰ تھا۔ اس نظم میں نہ صرف اسرار طاقت بلکہ معرفت کے بیان بھی ہیں۔ کتاب نو ابواب میں ہے۔ شروع ہی کے چند اشعار میں ہر باب کا موضوع بتا دیا گیا ہے۔ مثلاً:-

''پہلے باب میں میں بتاؤنگا کہ درویشی کیا ہے۔
دوسرے باب میں نماز کا بیان اور مختلف فرقوں میں اس کی صورتیں کیا کیا ہیں
تیسرے باب میں مقدس کتاب کے بموجب جسم پر بحث۔

چوتھے باب میں راوی کا بیان اور یکے بعد دیگرے سبھوں کی پرکھ ہے ۔

پانچویں باب میں کتابوں کے بموجب دل کا ذکر آیا ہے

چھٹے باب میں صحت اور انصاف کے ساتھ راوی کی تقریریں ہیں ۔

ساتویں میں مانی کی تقریر ہے ۔

جو عربی زبان میں چاند سے گفتگو کرتا ہے ،، ۔

مذکورہ بالا فہرست سے موضوعات کے تنوع اور کتاب کی ضخامت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ یہ کتاب در حقیقت عارفانہ عشق کی لغت ہے ۔

محمد وزیر علی : آپ ہزارہ سب ڈویژن (چاٹگام) کے گاؤں چاریا میں پیدا ہوئے ۔ آپ نے اپنے بڑے بھائی شہزادہ نذیر علی کی خواہش پر '' شاہنامہ یا نسل آونسان ۔ اسلام آباد '' لکھی ۔ نذیر علی ہی نے نذیر ہاٹ قائم کیا ہے جو ''فتک چاری تھانہ،، کے جنوب میں ہٹ ہزاری تھانہ کی شمالی سرحد پر واقع ہے ۔ انہوں نے تاریخ بھی دی ہے ۔ ۱۱ء ۱۴ میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور سات برس کے بعد مکمل ہوئی ۔ کتاب کے مضمون کے تفصیلی بیان کی گنجائش نہیں البتہ یہاں چند

کہانیوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے :

''اسلام آباد کی کہانی،، : شہزادہ نذیر علی کے افعال حمیدہ ۔ تاریخ کا واضح بیان ۔ محمدی خلافت نامہ ۔ شہر بغداد کی تاریخ ایک کنیز کی تنبیہ پر شاہ بدر الدین کا استغراق ۔ بدر اولیا کا استغراق، وغیرہ وغیرہ' شاعر وزیر علی کی ایک اور کتاب کا بھی پتہ چلا ہے، جو ایک بیانیہ نظم پر مشتمل ہے ۔

شیخ سعدی : آپ ضلع ٹپرہ کے رہنے والے معلوم ہوتے ہیں ۔ کیونکہ یہیں ان کے مسودے جمع کئے گئے ہیں ۔ ان کی کتاب کا نام '' گرو مالیکا '' (درویش اور مالیکا) ہے ۔ ویسے یہ ہے تو بیانیہ نظم لیکن اس میں سوال و جواب کے طرز پر مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں ۔ ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ نظم ۱۷۱۵ء میں لکھی گئی ہے کہانی حسب ذیل ہے :

روم کی شہزادی مالیکا نے فیصلہ کیا کہ جو شخص اس کے ایک ہزار سوالوں کا صحیح جواب دیگا وہ اسی کے ساتھ شادی کریگی ۔ قسمت آزمائی کے لئے مختلف ملکوں سے ہزاروں شاہزادے آئے لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی ۔ انمیں سے چند قید کرلئے گئے اور بعضوں کو ذلیل و رسوا کر کے نکال دیا گیا ۔

بالآخر عبدالحیکم نامی ایک درویش ترکی سے آئے ۔ انہوں نے سارے سوالوں کا جواب دے دیا ۔ چنانچہ شہزادی کے ساتھ ان کی شادی ہوگئی اور اس کے بعد انہوں نے روم پر حکومت کی ۔

حیات محمود: یہ مغلیہ عہد کے آخری شاعر گذرے ہیں ۔ آپ ضلع رنگپور کے گاؤں جھروی شیلا میں جو کہورو گھاٹ کے سلونگر پرگنہ میں واقع ہے، پیدا ہوئے ۔ آجکل یہ گاؤں اس ضلع کے پیرگنج تھانہ میں شامل ہے ۔ ان کے والد کبیر بھی شاعر تھے۔ آپ زمیندار کہورو گھاٹ کے دیوان بھی رہ چکے ہیں ۔ حیات محمود کے ابتک چار مسودوں کا پتہ چلا ہے ۔ ان کے نام اور تاریخیں حسب ذیل ہیں :—

(الف) ''جنگ نامہ،، یا ''محرم تہوار،، - ۱۷۳۳ ء

(ب) چت آدھان (دل کا باغ) یا سروا بھید (اختلاف کل) ۱۷۳۲ ء

(ج) ھتا جنان بانی (اقوال دانش) ۱۷۵۳ ء

(د) انبیا بانی (نبیوں کی آوز) ۱۷۵۸ ء

''جنگ نامہ،، میں کربلائے معلیٰ کا المیہ ہے ۔ شاعر نے واقعہ بیان کرنے میں تاریخ کی مدد لی ہے اور جبرئیل ع

کی زبان سے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں کی پردرد شہادت ، زہر نوشی کے بعد حضرت امام حسن کی المناک وفات ، قاسم کی بیوہ دلہن کی آہ و زاری ۔ کربلا میں اعدا کے ہاتھوں حضرت امام حسین کی شہادت ۔ ان سارے واقعات نے کتاب کو بیحد پر اثر بنا دیا ہے۔

" جت ادھان " : سنسکرت کی کتاب " ہت اپدیش " کے فارسی ترجمہ کو سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے ۔ اس میں اس کی کہانیاں بھی بیان کی گئی ہیں ۔ شاعر نے کہا ہے کہ بنگالی سال ۱۱۳۹ میں یہ کتاب لکھی گئی ۔

" ہتا جنان بانی " : اس میں مسلمانوں کی تعلیم اور اقوال و دانش پر بحث ہے۔ شاعر نے خود کہا ہے کہ اس کتاب میں مذہب کا ذکر ہے۔ شاعر نے یہ بھی کہا ہے کہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میری اس کتاب سے قارئین کو فائدہ پہنچیگا مجھے دعائیں دی جائیں گی اور اس طرح حیات بعد از مرگ میں مجھے سکون ملیگا ۔ انہوں نے اس کتاب میں وعظ ' قوانین شریعت ' واجب ' نماز ' قیامت وغیرہ موضوعات پر بحث کی ہے ۔

"انبیا بانی": (صدائے انبیا): ان کی آخری تصنیف ھے۔ ان دنوں آپ اتنے ضعیف ھوچکے تھے کہ اس کے بعد کچھ نہ لکھ سکے۔ انھوں نے خود اپنی ضعیفی اور بعض نظموں پر انتہائی محنت کرنے کا ذکر کیا ھے۔ اس میں حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراھیم خلیل اللہ، حضرت ادریس، حضرت صالح، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت محمدؐ کی حیات اقدس کی تصویریں کھینچی گئی ھیں۔ یہ نظم تخلیق نور محمدی کے بیان سے شروع ھوتی ھے جس میں بتایا گیا ھے کہ کس طرح یہ "نور" تمام پیغمبروں کی پیشانی پر چمکتا رھا اور پھر کیسے حضرت آمنہ کے بطن سے ھویدا ھوا۔ اس میں دنیا کی تاریخ بھی بیان کی گئی ھے۔

غرض اس عہد میں اتنے بکثرت مسلم شعرا موجود ھیں کہ ھر ایک کا تنقیدی جائزہ پیش کرنا یہاں ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ اس عہد پر کافی تحقیقی کام بھی نہیں ھوا ھے۔ یہاں جو تجزیہ کیا گیا ھے اس سے گو اس عہد کے ادب کی بھر پور عکاسی نہیں ھوتی لیکن اس ادب کی تہذیبی فضا نے اپنے آثار ضرور باقی چھوڑے ھیں۔

باب پنجم

ریاستوں میں ادبی سرگرمیاں

مغلیہ دور کی ادبی ترقیوں پر پچھلے ابواب میں دفی بحث ہوچکی ہے - گو ان کے علاوہ بھی، یعنی مغلیہ سلطنت کے باھر بھی، دو آزاد ریاستوں میں ادب نشوو نما پا تا رھا تھا اور وہ دونوں آزاد ریاستیں تری پورہ اور روزنگ تھیں - اگرچہ دونوں ریاستوں نے بنگال میں حکومت مغلیہ کے ختم ھونے تک، اپنی آزاد حیثیت بر قرار رکھی، لیکن وہ مغلیہ تہذیب، وثقافت سے بہت کچھ متاثر ھو رھی تھیں -

آج کی طرح اس وقت بھی ان ریاستوں میں بنگلہ بولنے والے مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی - چنانچہ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس زمانے کے عام ماحول کی بدولت، فارسی زبان بھی بنگلہ کے ساتھ ساتھ، وھاں دفی مقبول اور رائج ھو گئی تھی -

بنگلہ ادب میں ان دو ریاستوں نے مسلمانوں کا اثر

زبردست حصہ رہا ہے کہ اس کے ذکر کے بغیر دور مغلیہ کے مسلم بنگلہ ادب کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ بنگلہ ادب کو روزنگ اور تریپورہ کے درباروں میں مغلیہ دربار سے بھی زیادہ سرپرستی نصیب ہوئی۔ چنانچہ اب یہاں ہم بنگلہ ادب کے ان گہواروں کا ذکر کریں گے۔

روزنگ ــــ راجاؤں کے دربار میں

''روزرنگ،، یا ''روزنگا'' موجودہ اراکان کا پرانا نام ہے۔ خود اراکانی لوگ اسے ''رنہائنگ تانگی،، یعنی دیووں کی سرزمین کہتے ہیں اور یہ سنسکرت ''راکھشا نونکا،، کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بنگلہ لفظ ''تانگ،، دراصل سنکرت لفظ ''تند'' سے لیا گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ''تانگ،، کا لفظ غیر آریائی زبان کا ہو۔ بہرحال ''راکہائنگ تانگی،، لفظی طور پر سنسکرت کے ''راکھسا نونکا،، سے مشتق معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس میں فائدہ صرف کے مطابق ''انگ'' اور ''ای،، کا اضافہ ہو گیا ہے۔ آجکل ''رنہائنگ،، کو اراکان بھی کہتے ہیں۔

اس وقت یہ بتانا تو مشکل ہے کہ مغلوں کے زمانے میں اراکان کا حدود اربعہ کیا تھا کیونکہ اس علاقے کے بہت

سے حصے مختلف ریاستوں کا حصہ بنتے رہے ہیں لیکن اتنا
ضرور ہے کہ چٹگام کا بہت بڑا حصہ، خصوصاً کرنا فلی کے
جنوب کا میدانی علاقہ اس زمانے میں اراکان میں شامل
تھا۔ ''ماگھی،، جنتری آج تک سارے چٹگام میں رائج ہے،۔
اور دن ، تاریخ اسی حساب سے شمار ہوتی ہے۔ اس سے صاف
ظاہر ہے کہ اس علاقہ پر اراکانی اثرات و روایات کس
حد تک بڑھ چکے تھے بلکہ بڑا سر چشمہ جہاں سے بنگلہ ادب کا اثر
پھیل کر سارے اراکان پر چھا گیا در اصل چٹگام ہی تھا۔

آج ہمارے زمانے میں بھی اراکان کے مسلمان بنگالیوں
اور برمیوں دونوں کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔

جیسا کہ مولف ہذا نے اپنی ایک اور کتاب ''اراکان
راج بنگلہ ساھتیہ'' (اراکان دربار کا بنگلہ ادب) میں
دکھانے کی کوشش بھی کی ہے' یہ واقعہ روزنگ
راجاؤں میں سے ''مہاتوبانگ.. ساندھیا،، یا '' مہات چندرا''
(۷۸۸ء تا ۸۱۰ء) کے دور کا ہے کہ عرب تاجروں نے
چٹگام آکر مستقل سکونت اختیار کرنا شرع کی۔ کسی حد
تک ان عرب تاجروں کی بدولت یہ ہوا کہ آٹھویں اور نویں صدی
عیسوی میں اس علاقہ میں اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور

پندرھویں صدی عیسوی کے بعد سے روزنگ را جاؤں پر اسلام کا اثر زیادہ سے زیادہ پڑنے لگا - ۱۴۳۰ ع میں روزنگ کی ریاست ' گوڑ سلطنت کی باجگزار ریاست بن کر رھگئی اور اسی زمانے میں گوڑ سے بہت کثرت سے مسلمان آ آ کر " موروھانگ " یا " مورنگ " میں آباد ھونا شروع ھوگئے - اُن کی عام زبان بنگلہ تھی - یہ بھی قابل غور بات ھے کہ ۱۴۳۴ء سے لیکر ۱۶۴۵ء تک ' روزنگ کے تمام آزاد و خود مختار راجاؤں نے اپنے قدیم اراکانی ناموں کے ساتھ مسلمانوں کے شاھی لقب بھی استعمال کرنا شروع کردئے تھے جیسے کہ کلیم شاہ ، سکندر شاہ ' سلیم شاہ ' حسین شاہ ، وغیرہ وغیرہ - مغلوں ، پٹھانوں اور قدیم اراکانی باشندوں کے مابین کوئی زیادہ بھائی چارہ نہ تھا ' مگر اراکانیوں نے مسلمانوں کے رسم و رواج اختیار کرلئے تھے اورمسلمانوں کے تہوار مناتے تھے - غالباً بنگالی مسلمانوں کے نسبتاً اعلیٰ تر تمدن سے وہ متاثر ھوئے بغیر رہ ھی نہ سکتے تھے - ریاست کے تمام بڑے بڑے عہدوں ، جیسے وزیر اعظم ، درباری امراء وزیر لشکر اور عدالت العالیہ یعنی ھائی کورٹ کے

صدر اور ججوں وغیرہ کے عہدوں پر مسلمانوں ہی کا
تقرر عمل میں آتا تھا۔ راجہ اگرچہ بودھ ہوتا تھا مگر
بڑے تعجب کی بات ہے کہ تاجپوشی کی رسم بودھ
بھکشوؤں (فقرا) کے ہاتھوں نہیں انجام پاتی تھی بلکہ
مسلمان وزراء یہ فرض انجام دیتے تھے۔ اس کی وجہ
شاید یہ تھی کہ تاجپوشی ایک دنیاوی یعنی غیر مذہبی
رسم سمجھی جاتی ہے۔

علاول نے اپنے ''سکندر نامہ،، میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ
کس طرح ''وزیر اعظم مجس،، نے، جو عام طور پر '' نواراج '' کے
لقب سے مشہور تھا، راجہ سری چندر تھودما (۱۶۵۲ء تا
۱۶۸۴ء) کی رسم تاجپوشی ادا کی — وہ لکھتا ہے :-

مجلس زرق برق کپڑوں میں ملبوس
راجہ کے سامنے تعظیم سے جھکی اور میں نے یوں
عرض کیا :

اے راجہ ! اپنی رعایا کو اپنی اولاد کی طرح رکھیو
میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ ان پر اعتماد نہ کھونا
ریاست کے سارے کاموں میں انصاف اور رحمدلی برتنا
فیاضی سے کام لینا، نیک رہنا اور خدا ترس رہنا
اچھے لوگوں کو خوش رکھنا اور برائی کو جڑ سے

اکھاڑ پھینکنا
مستقل مزاجی سے کام لینا اور تصنع اور بناوٹ نہ کرنا
کسی نے اگر بہت زمانہ پہلے کوئی غلطی کی ہو تو
اسکو سزاوارا نہ ٹھیرانا
راجہ نے اس کا وعدہ کیا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ تمام
دوسرے شاہانہ اعمال و فرائض انجام دے گا
پھر مجلس نے سب سے پہلے جھک کر تعظیم ادا کی
اور سب کے بعد پھر راجہ کے نونہال عزیزوں نے
تعظیم ادا کی "۔

اس طرح اراکان کے راجاؤں کا دربار سترھویں صدی عیسوی تک اسلامی رسوم و رواج سے معمور رہا۔ اراکانیوں کو اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے تو زیادہ متاثر نہ کرسکا لیکن ان پر اسلامی تہذیب کا بڑا اثر رہا۔

اراکان میں جو اسلامی تہذیب بنگالی مسلمانوں کے ذریعے پہنچی اس میں بنگلہ خصوصیات پوری طرح نمایاں تھیں۔ اراکان کے آزاد علاقے میں بنگلہ زبان او بنگلہ ادب خوب اچھی طرح رائج ہو گیا

حالانکہ اراکان سیاسی طور پر بنگال کا حصہ نہ تھا۔ وہاں کے لوگوں میں بنگلہ اثر داخل ہونے کا بڑا سبب یہی تھا کہ اراکانی زبان و ادب کے مقابلے میں بنگلہ زبان وادب کی بلندی و بہتری مسلم تھی۔ دربار اور سرکاری دفتروں کے بنگالی افسروں نے بھی بنگلہ زبان سیکھنے کی ہمت افزائی کی۔

مسلمان افسروں میں سے جنہوں نے بنگلہ پڑھنے اور سیکھنے کی بہت ہمت افزائی کی، ان میں اشرف خاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جو راجا ''تھد ما،، کے دربار میں ''لشکر وزیر،، یعنی فوج کے اعلیٰ ترین افسر تھے۔ اشرف خاں ھی کے کہنے پر دولت قاضی نے ''ستی مینا،، لکھی۔ اشرف خاں، چٹگام کے رھنے والے تھے۔ ان کے محل کے بعض آثار قدیمہ موجودہ ضلع ھٹ ھزاری کے ایک موضع ''چاریا،، میں اب بھی پائے جاتے ھیں۔ ''روزن،، پولیس اسٹیشن کے حدود میں کادل پور گاؤں میں ''لشکر وزیر،، کا تالاب بھی اشرف خاں ھی کی یادگار ھے۔

راجہ شری تھد ما کے دربار کا ایک اور شاعر مردان تھا۔ جس نے ''مردان نامہ،، لکھا ھے۔ راجہ شری تھد ما کا جانشین ''نری پاتگری،، یا ''نرا بادگی،، نامی راجہ ھوا ھے (۱٦۳۸ء تا ۱٦٤۵ء)۔ اس کے بعد سات برس تک اراکان میں خانہ جنگی ھوتی رھی

اور اس خانہ جنگی کے نتیجہ میں چٹگام سے ڈھاکہ تک کا علاقہ اراکان کی قلمرو سے نکل گیا ۔ یہ بڑا بد امنی کا دور تھا اور اس زمانہ کی کوئی ادبی تخلیق نہیں ملتی ۔ دوسرا راجہ ''تھادو منتور،، (۱٦۴۵ تا ۱٦۵۲ء) تھا ۔ اس کا دور بہت کامیاب رہا ۔ اس کے عہد میں علاول نے ،، پد ماوتی ،، مرتب کی ۔ اسے اس وقت کے وزیر اعظم' مگن ٹھاکر' کی سر پرستی حاصل تھی ۔ 'ٹھاکر، دربار اراکان کے بڑے اعلیٰ اور معزز خطابوں میں سے تھا ۔ 'ٹھاکر مگن ، قریشی مسلمان تھا ، خود بھی شاعر تھا اور اسکی ایک نظم '' چندراوتی ،، کا نسخہ ابھی حال ہی میں دستیاب ہوا ہے ۔

راجہ ''تھادو منتور،، کی موت کے بعد ، اس کا بیٹا ''ساندا تھدا ما'' ۱٦۵۲ء تا ۱٦۸۴ء میں روزنگ کا راجہ بنا ۔ ٹھاکر مگن اس کا بھی وزیر اعظم رہا اور شاعر علاول کو اسکی سرپرستی بھی حاصل رہی ۔ مگن کی موت کے بعد ایک اور مسلمان' مسمی سلیمان وزیر اعظم مقرر ہوا ۔ اس وقت سید محمد ، فوج کا سپہ سالار تھا ۔ اور اسی افسر کی سرپرستی میں علاول نے '' سبتا پیکر ،، لکھی ۔ راجہ ساندا تھدا ما کے دربار میں ایک اور امیر ''نوراج مجلس'' بھی تھا اور مجلس ہی کے اصرار پر علاول نے ''سکندر نامہ،، کا فارسی

سے بنگلہ نظم میں ترجمہ کیا۔ راجہ ساندا تھدما کا ایک اور وزیر سید موسیٰ تھا اور اس کے اصرار پر علاول نے "سیف الملک" لکھی۔

علاول نے اراکان میں جو ادبی فضا پیدا کردی تھی وہ اس کے مرنے کے بعد بھی بہت زمانے تک پھلتی پھولتی رہی۔ اگرچہ ان بہت سے شاعروں کا اب نام نشان بھی کوئی نہیں جانتا جو علاول کے شاگرد یا متبع تھے مگر علاول کے ایک شاگرد کے نام کو اس کے ایک ادبی کارنامے نے ابتک زندہ رکھا ہے اور وہ عبدالکریم خواندکار ہیں۔ عبدالکریم خواندکار نے ۱۷۰۵ء میں اراکان کے راجہ کے ایک درباری کی فرمائش پر "دلا مجلس" لکھی تھی۔ یہ تصنیف تین برس میں مکمل ہوئی اور اس سارے عرصے میں عبدالکریم خواندکار اراکان کے پایہ تخت "مروھانگ" ہی میں مقیم رہا۔

ابتک تو اراکان کی تہذیبی دنیا کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا۔ اب یہاں اس ملک کے شاعروں اور ان کے شہ پاروں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے:

دولت قاضی

اراکانی دربار کا سب سے پرانا اور سب سے زیادہ مشہور شاعر ہے۔ یہ ۱۶۰۰ء تا ۱۶۳۸ء

اس زمانے کے روزن پولیس اسٹیشن' کے قصبے ، سلطان پور، کے قاضی گھرانے کا فرد تھا - کہا جاتا ہے کہ بہت کم عمری میں اس نے بڑا کمال پیدا کرلیا تھا لیکن محض کم سنی کی وجہ سے لوگوں نے اسکی فضیلت و قابلیت تسلیم نہ کی - اس قدر ناشناسی سے تنگ آ کر وہ اپنے وطن سے نکل کر اراکان کے دربار پنہچا ، جہاں کی قدر شناسی کا شہرہ وہ بہت سن چکا تھا - یہاں اس کی بڑی قدر کی گئی اور راجہ شری تھدا ما ۱۶۲۲ تا ۱۶۳۸ء کے وزیر لشکر اشرف خاں کی سرپرستی میں اس نے خوب خوب ادبی جولانیاں دکھانی شروع کیں - اسکی مشہور نظم "ستی مینا - لور چند رانی ،، ہے -

یہ نظم تین حصوں میں ہے - پہلے حصے ،، پریچے ،، یعنی تعارف' میں شاعر نے هیرو اور هیروئن کا تعارف کرایا ہے اور انکی ازدواجی زندگی بڑی تفصیل سے پیش کی ہے - گو انکی ازدواجی زندگی کچھ اچھی طرح بسر نہ ہوئی تھی -

دوسرا حصہ علیحدگی یا ،، فراق ،، سے موسوم ہے - اس حصے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہروئین "مینا باتی" روح کی صفائی اور پاکیزگی کے دور سے گذر رهی ہے اور فراق کے مصائب

برداشت کر رہی ہے۔ اس دوران میں اسے ''چھاتن'' کے ورغلانے کا سامنا کرنا پڑا اور اس مضمون کو شاعر نے بڑی ہی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

تیسرے اور آخری حصے میں باز دید یا 'پنر ملن' کا ذکر ہے۔ مینا اور اس کا شوہر ''لور''، اسکی دوسری بیوی چندرانی' سب آپس میں مل جاتے ہیں۔

دولت قاضی نہ صرف قدیم بنگال کے مسلمان شاعروں میں سب سے ممتاز ہے بلکہ بنگلہ زبان کے بہترین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ اسے بنگلہ اور برج بولی دونوں پر پوری قدرت حاصل تھی اور اس نے یہ دکھایا کہ رادھا اور کرشنا کے عشق و محبت کے گیتوں کے علاوہ بھی ورج یا برج بولی کو بنگلہ زبان کے ساتھ بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے سمویا جا سکتا ہے۔

مردان : دولت قاضی کے ہمعصروں میں سے (۱٦۰۰ء تا ۱٦۴۵ء) صرف مردان ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کا کلام امتداد زمانہ کے ہاتھوں سے کچھ محفوظ رہ سکا ہے۔ صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے وہ دولت قاضی کے برابر نہیں ہے لیکن اراکان کے راجہ شری تھدما کی سرپرستی اس کو بہت حاصل رہی اور اسی راجہ کے لئے اس نے

اپنی نظم 'ناصرہ نامہ' لکھی تھی - اس نظم میں راجہ شری تھدما کی بڑی مدح کی گئی ہے - یہ شاعر غالباً روزنگ ہی کے ایک شہر 'کانچی' کا رہنے والا تھا -

'ناصرہ نامہ' ایک بیانیہ نظم یا مثنوی ہے - یہ بالکل طبعزاد نظم ہے- اس نظم کا خاص موضوع ,, قسمت ،، یا ,, تقدیر ،، ہے اور یہ ناقابل تسخیر قوت ہے- قصہ یوں ہے کہ عبدالکریم اور عبدالنبی ، دو تاجر ہیں - آپس میں بڑے دوست ہیں - عبدالکریم کی لڑکی ناصرہ ، عبدالنبی کے لڑکے عبدالصابر سے منسوب تھی - قسمت کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ عبدالکریم پر برے دن آگئے اور اس کے دوست نے یہ نسبت چھڑادی - عبدالکریم نے اس ذلت کو بہت محسوس کیا - مگر اسکی بیوی ایک کہانی سنا سنا کر اسکی دلدھی کرتی رہی- اس کہانی میں یہی بتایا گیا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی طاقت قسمت ہی ہے - بالآخر قسمت نے پلٹا کھایا اور عبدالکریم پھر دولت مند ہوگیا اور ناصرہ کی شادی عبدالصابر سے ہوگئی -

مگن ٹھاکر: جیسا کہ مؤلف ھذا نے اپنی کتاب " اراکان راج سبھئے (۱۶۰۰ تا ۱۶۶۰ء) بنگلہ ساھتیہ " (اراکان راج دربار میں بنگلہ ادب)

میں ثابت کیا ہے' مگن ٹھاکر اور قریشی مگن ایک ہی شخصیت ہے جو ,, چندراوتی '' کا مصنف اور علاول کا بڑا سرپرست تھا ۔ یہ اراکان کا رہنے والا تھا اور صدیقی قریشی خاندانوں کا چشم و چراغ تھا ۔ اس کا اصلی نام معلوم نہ ہو سکا ۔ 'مگن' یا ''ما گن'' صرف عرف ہے جس کے معنی ہیں 'خدا کی دین یا نعمت خداوندی' ۔

خود علاول نے جو کچھ اسکی بابت لکھا ہے ، اس سے ظاہر ہے ٹھاکر' بڑی اعلیٰ قابلیتوں کا آدمی تھا ۔ عربی ، فارسی ، سنسکرت اور برمی زبانوں میں مہارت تامہ رکھتا تھا اور بنگلہ زبان پر اسکی قدرت ,, چندراوتی '' سے ظاہر ہے ۔ وہ فن موسیقی اور ڈرامہ میں بھی دسترس رکھتا تھا ۔ وہ ۱۶۶۰ء میں خاصی عمر پاکر مرا اور اسکی وفات سلطان شاہ شجاع کی وفات کے بعد واقع ہوئی ۔

,, چندراوتی ،، ایک مثنوی یا بیانیہ نظم ہے اور پریوں کی کہانیوں جیسی معلوم ہوتی ہے ۔ چندراوتی کے راجہ چندر سین کا لڑکا' بیربھان اس نظم کا ہیرو ہے اور ہیروئن' چندراوتی سراندیپ (لنکا) کے راجہ سور پال کی بیٹی ہے ۔ قصہ یوں

ھے کہ دونوں نے ایک دوسرے کی شہرت سنی اور نادیدہ ایک دوسرے پر فریفتہ ہوگئے۔ ہیرو نے ایک ہزار کشتیوں کا بیڑہ تیار کیا (جس میں ' جلیا '، اور ' گراب ' نامی کشتیاں بھی تھیں) اور چندراوتی سے بیاہ کرنے لنکا پہنچا۔ بیر بھان کے وزیر اعظم کا لڑکا 'سوت'، جو اس کا بڑا دوست بھی تھا، ساتھ چلا۔ بیڑے کو راستے میں ایک بڑے طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ اور بڑے مصائب کے بعد یہ بیڑہ سمندر پار کر کے لنکا پہنچا مگر چندراوتی اس وقت کسی اور کے ساتھ بیاہی جاچکی تھی۔ بیر بھان کی بےتابی کی کوئی حد نہ رھی۔ سوت اسکی دل دھی کرتا رھا اور راجکمار کو سمجھاتارھا کہ وہ سوت کی سمجھ بوجھ اور دانشمندی پر اعتبار کرے۔ وہ اپنی بات کا پکا ھے۔ بہرحال چند بہت دلچسپ واقعات کے بعد بالاخر چندراوتی کا بیاہ بیر بھان کے ساتھ ہوگیا۔

شاعر اعظم علاول: (۱۶۰۷ء تا ۱۶۸۰ء)

علاول کا شمار اگرچہ روزنگ کے بہت سے شاعروں کی فہرست میں ھوتا ھے لیکن واقعہ یہ ھے کہ علاول، بنگال کے مسلمان شاعروں میں سب سے زیادہ بلند ھے۔ اس کو عمر بھی سب سے زیادہ ملی۔ اس کا کلام بھی تمام قدیم و

جدید بنگلہ شاعروں میں سب زیادہ ھے ۔ کیا مضون آفرینی میں اور کیا طرز نگارش کی خوبیوں میں، بہت کم شاعر اس کے مقابلہ پر آتے ھیں ۔ البتہ دولت قاضی ھی ایک شاعر ھے جسے تخئیل کی بلندی میں علاول سے بھی بڑھکر سمجھا جاسکتا ھے ۔

علاول کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ھے خود مؤلف ھذا نے بہت تفصیلی تذکرے لکھے ھیں اور دوسرں نے بھی ابتک اتنا کچھ علاول کے متعلق لکھا ھے کہ اس وقت ھم صرف مختصر طور سے ھی اس کا ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے ۔

علاول چٹگام کے تھانے ھت ھزاری کے ایک گاؤں 'جوبرا' میں ۱۶۰۷ ء میں پیدا ھوا ۔ شاعر مقیم نے شعرائے چٹگام کا جو مبسوط تذکرہ مرتب کیا ھے اس میں علاول کے حالات بیان کرتے ھوئے اس نے لکھا ھے کہ علاول کے آبا و اجداد کا وطن گوڑ تھا ، لیکن خود علاول کی عمر کا بیشتر حصہ اراکان میں بسر ھوا اور زندگی کے آخری چند سال وہ دیہات میں اپنے مکان ھی پر رھا ۔ " علاول تالاب " اور " علاول مسجد " آج بھی موجود ھیں اور اس کے نام سے موسوم ھیں ۔

علاول کی زندگی بڑے عیش و عشرت اور رنگینیوں میں گذری ۔ وہ مجلس خاں کے ایک مصاحب کا لڑکا تھا ، اور مجلس خاں فتح آباد کا حاکم تھا ۔ فتح آباد کو فرید پور کی " سرکار فتح آباد " سے کوئی تعلق نہیں ھے محض نام سے التباس ھوتا ھے ۔ بالکل ویسے ھی جیسے لفظ " گنگ " دریا کا مرادف ھے لیکن گنگا سے ھمیشه دریائے گنگا ھی مراد لی جاتی ھے ۔ اگر گنگا کے معنی دریا لئے جائیں تو غلط نہیں ھوگا ۔ اسطرح ھم ناموں کے التباس سے بچ سکتے ھیں ۔

فتح آباد کا جو نقشه علاول نے کھینچا ھے ، اسے پڑھ کر دولت قاضی کا کھینچا ھوا نقشه بے اختیار یاد آجاتا ھے ۔

" فتح آباد ، چٹگام کا ایک بڑا مشہور قصبه ھے ' اور یه قصبه اس مقام پہ واقع ھے جہاں چٹگم کا دریائے ھلدا ، دریائے کرنافلی سے آملتا ھے "

علاول کا باپ چند یوروپی ڈاکوؤں سے لڑتے ھوئے ایک دریائی کشتی میں مارا گیا اورخود علاول بچ کر اراکان تک پنچ گیا مگر اس کے بھی شدید زخم آئے تھے ۔ اراکان میں علاول ' راجه تھادو منتور (۱۶۴۵ ء تا ۱۶۵۲ ء) کے شاھی

محافظ دستے میں بھرتی ہو گیا ۔ اس کی علمی قابلیت اور شاعرانہ صلاحیتوں کا شہرہ وزیر اعظم مگن ٹھاکر تک پہنچا ، اور علاول کو اسکی سرپرستی حاصل ہو گئی اور اس نے تلوار کو خیرباد کہکر قلم سنبھال لیا ۔

جب شاہ شجاع ۱۶۶۰ء میں اراکان میں مارا گیا تو علاول کی قسمت نے ایک بار اور پلٹا کھایا اور ایک ذی اثر شخص نے علاول کو چند روز کے لئے قید خانے میں ڈلوا دیا ۔ لیکن وہ جلد رہا کر دیا گیا ۔ اس کے بعد علاول کا خاص سرپرست مگن ٹھاکر بھی چل بسا اور علاول کے لئے ایک نیا دور تنگی اور مصائب کا آپہنچا ۔ مگر چند ہی سال بعد حالات بہتر ہو گئے ۔ یکے بعد دیگرے اس کو اچھے اچھے خوشحال سرپرست ملتے رہے جیسے سید موسیٰ' جو فوج کا سپہ سالار تھا ، سید محمد خاں ، وزیر نوراج مجلس اور ایک اور رئیس وقت' شریمانتا سلیمان ۔ مگر دراصل مگن ٹھاکر کی موت کے بعد وہ کبھی پوری طرح خوش نہ رہ سکا ۔ علاول نے دربار کے انعام' اکرام کو ہمیشہ بھیک کے ٹکڑے خیال کیا بلکہ بسا اوقات تو اس نے اپنے کلام میں بھی اپنی قسمت سے شکوہ کیا ہے کہ بھیک مانگ کر زندگی گذارنی پڑی ۔

علاول ''سیف الملک'' میں ایک جگه لکھتا ھے که :
''میں نے بہت سی نظمیں لکھی ھیں،، ۔ لیکن بد قسمتی سے آج اسکی صرف پانچ بڑی بڑی نظمیں ھی دستیاب ھوئی ھیں ' باقی سب، معلوم ھوتا ھے، ھمیشه کے لئے تلف ھوگئیں ۔ بہر حال وہ پانچ بڑی بڑی نظمیں یه ھیں :-

(ا) ''پدماوتی'' : یه ملک محمد جائسی کی اسی نام کی هندی کتاب سے ماخوذ ھے۔ بلکه یه کہنا چاھئے که اس کا بنگله زبان میں آزاد ترجمه ھے ۔ جو علاول نے روزنگ کے راجه سادا منگ دار (۱٦۴۵ تا ۱٦۵۲) کے عہد کے آخری زمانے میں (یعنی ۱٦۵۱ء ۱۳ . ۱ ماگھی) میں مکمل کیا ۔

(ب) ''ستی مینا'' : پدماوتی مکمل کرنے کے فوراً ھی بعد ''ستی مینا اور لورچند رانی'' کے آخری بند مکمل ھوئے ۔ ایک درباری، شری مانتا سلیمان نے علاول کو ترغیب دی تھی که دولت قاضی کی لکھی ھوئی ناتمام کہانی کو پورا کر دے اور یه کام ۱٦۵۸ء میں مکمل ھوگیا، جیسے دودھ میں شہد کی آمیزش کی گئی ھو ۔

(ج) ''ھفت پیکر،، : اس کتاب کو شروع کرنے سے

قبل ہی علاول نے "سیف الملک" کا پہلا حصہ مکمل کر لیا تھا جس کی فرمائش علاول سے مگن ٹھاکر نے ۱۶۵۹ میں کی تھی مگر مگن ٹھاکر کا اسی دوران میں انتقال ہو گیا اور سپہ سالار، سید محمد کی فرمائش پر ۱۶۶۰ء میں علاول نے "ہفت پیکر" لکھنا شروع کر دیا۔ یہ بھی فارسی کی اسی نام کی ایک کتاب سے ماخوذ ہے۔

(د) "تحفہ": ۱۶۶۴ء میں "ہفت پیکر" مکمل کر چکنے کے بعد علاول نے فارسی شاعر، یوسف گدا کی کتاب "تحفہ" (مرتبہ ۷۹۵ھ یا ۱۳۹۲ء) کا ترجمہ شروع کر دیا۔ یہ قصے کہانیوں کی کتاب نہیں بلکہ ایک مذہبی کتاب ہے۔ اسے مکمل کرنے میں علاول کو چار سال لگ گئے۔ یہ ایک طرح سے فقہ کی کتاب ہے، جیسے ہندوؤں کے یہاں "سنہتا" ہوتی ہے۔ اس کتاب میں جو مذہبی مسئلے مسائل وغیرہ درج ہیں ان پر اب تک بنگالی مسلمانوں میں عمل درآمد کیا جاتا ہے، ویسے بھی یہ کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔

(ہ) "سیف الملک": یہ کتاب مگن ٹھاکر کی فرمائش پر شروع کی گئی تھی اور اس کے مرنے کے نو برس بعد ۱۶۶۹ء میں اراکان کے راجہ کے مصاحب خاص، سید موسیٰ کے

اصرار پر مکمل کی۔ یہ بھی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(د) ''سکندر'' نامہ ۱۶۷۳ء میں مکمل ہوا۔ یہ علاول کا آخری ادبی کارنامہ ہے جبکہ وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کی زندگی کے دن' بقول خود اس کے ''بھکاریوں کی طرح تلخ'' گذر رہے تھے۔ ان دنوں وہ مجلس نوراج کے دربار سے منسلک تھا۔

ان ادبی شہ پاروں کے علاوہ اس نے بہت سے گیت اور بہت سی ''پداولیاں'' بھی لکھی ہیں، جن میں سے بعض تو حال میں دستیاب ہوئی ہیں۔

عبدالکریم خواند کار: دولت قاضی، مردان، مگن ٹھاکر' علاول

اور دوسرے نامور ادیبوں نے جن عظیم الشان ادبی روایات کی بنا' ڈالی تھی وہ علاول کی وفات پر ختم نہیں ہوگئیں۔ اس کا ثبوت عبدالکریم خواند کار کی زندگی اور کارنامے ہیں۔ اس ممتاز شاعر کی نظم ''دلا مجلس'' (۱۶۹۸ء) اب دستیاب ہو چکی ہے۔

اس سے پہلے بھی شاعر عبدالکریم خواند کار کرنے دو اور کتابیں لکھی تھیں۔ ایک تو ''ہزار مسائل'' اور دوسری ''تمیم انصاری'' اور ان کا تذکرہ اس نے خود اپنی اس نظم

میں بھی کیا ہے۔

عبدالکریم اراکان کا رہنے والا تھا۔ ''دلا مجلس،، میں اس کے جو خاندانی حالات درج ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالکریم خواندکار کے پردادا رمجو میاں کو راجہ کی طرف سے ''بشے پدبی،، ملی تھی اور وہ بحری چنگی کے کلکٹر کی حیثیت سے مامور تھے اور ان کے بیٹے محسن علی اسی محکمے میں مترجم کی حیثیت سے ملازم تھے۔ محسن علی کے بیٹے، علی اکبر، شاعر عبدالکریم خواندکار کے باپ تھے۔ عبدالکریم خواندکار کی زندگی زیادہ تر مروھانگ میں گذری اور وہیں راجہ اتی بار کے مہتمم خزانہ کی فرمائش پر عبدالکریم نے ''دلا مجلس،، لکھی۔ مروھانگ ۱۴۳۰ء سے ۱۷۸۵ء تک مسلسل اراکان کا پایہ تخت رہا۔

''دلا مجلس'': ایک فارسی کتاب کا آزاد ترجمہ ہے۔ اور تمام پیغمبروں کی روایاتی تاریخ ہے۔ حضرت آدم سے لیکر حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت شعیب حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے روایتی حالات درج ہیں، حضرت علی اور حضرت فاطمہ کا بھی ذکر ہے

اور انکے بعد حضرت بلال ، حضرت خالد ، حضرت حسن بصری اور حضرت حسن قریشی کے حالات ھیں اور ساتھ ھی ساتھ والیٔ نیشا پور، سلطان ابو سعید کے سوانح حیات بھی ھیں -

عبدالکریم خواند کار کی ''ھزار مسائل'' بڑی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں اسلامی قوانین مدون کئے گئے ھیں - اس نام کی ایک فارسی کتاب بھی ہے اور ایسا معلوم ھوتا ھے یہ اسی نام کی فارسی کتاب سے ترجمہ کی گئی ہے - خود عبدالکریم خواند کار نے لکھا ھے کہ اس نے ''ھزار مسائل'' ایک اور کتاب کی مدد سے مرتب کی ھے -''

اس کی ایک اور مذھبی تصنیف ''نور نامہ'' ہے جس میں دکھایا گیا ھے کے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور سے پیدا کیا -

تپرہ میں بنگالی ادب: اراکان کی طرح اس وقت کے تری پورہ کی جغرافیائی کیفیت ، حدود اربعہ اور مقام وقوع کا تعین بھی مشکل ہے - موجودہ نوا کھالی اور تپرہ کے ضلعے اس وقت کی سلطنت تری پورہ میں شامل تھے - ان ضلعوں میں آج بھی مسلمان آبادی کی اکثریت ہے - اراکان کے مقابلہ میں یہاں

یہ فرق تنہا کے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت شروع ہی سے حاوی رہی اور رفتہ رفتہ اس کا اثر اور بھی بڑھتا گیا ۔ اس علاقہ میں زیادہ تر قدیم نیم وحشی قومیں آباد تھیں اور یہاں "چکمہ" فرقے کی حکمرانی تھی ۔ شروع میں بنگالی ھندوؤں کے تمدن و تہذیب کا یہاں بڑا اثر تھا ، تا آنکہ مسلمانوں کی فتح کے بعد اسلامی تمدن و تہذیب کے اثرات بڑھنا شروع ہوئے ۔ اگرچہ تری پورہ کو مسلمانوں نے مکمل طور سے کبھی فتح نہیں کیا تاھم یہاں کے راج دربار ، عام لباس اور طرز حکومت پر مسلمانوں کا بڑا اثر نمایاں رہا ھے ۔ بنگلہ زبان کو یہاں ممتاز حیثیت حاصل رہی ھے ۔ یہ اس سے ثابت ھوتا ھے کہ یہاں کے پرانے سکوں اور دستاویزوں پر قدیم بنگلہ عبارتیں درج ھیں ۔

یہاں ھم مختصر طور سے مسلمانوں کے ان کارناموں کا تذکرہ کریں گے جو یہاں کی ادبی زندگی سے متعلق ھیں ۔

شیخ چاند : تری پورہ کے مسلمان اہل قلم میں سے (۱۵۶۰ء تا ۱۶۲۵ء) جن کے ادبی کارنامے ھم تک پہنچے ھیں ، سب سے زیادہ ممتاز شیخ چاند ھیں ۔ یہ ایک صوفی منش بزرگ اور اپنے زمانے کے بہت بڑے شاعر تھے ۔

مؤلف ھذا نے سب سے پہلے اس شاعر کے متعلق ایک مقالہ بیس برس قبل لکھا تھا ۔ اس کے بعد اس عظیم شاعر کے کارناموں پر بہت مفید تبصرے ہوتے رہے ہیں ۔ خصوصاً مولوی علی احمد نے بہت اچھی طرح روشنی ڈالی ہے ۔

سید مرتضیٰ علی نے ''سلہٹ ادبی مجلس'' کے تیسرے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ '' شیخ چاند موضع بگھیرھاٹ کا رھنے والا تھا جو جنوبی سلہٹ کے سب ڈویژن بھانو گاچ میں ہے ''۔ اس خیال کی تردید میں تو کوئی ثبوت بہ ظاہر نہیں ملتا ' لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کے شاعر کی ساری زندگی تری پورہ ھی میں گزری ' خصوصاً وہ زمانہ جو اولیں سرگرمیوں کا تھا ۔ تری پورہ ھی میں شاعر کے تمام تر مخطوطات دستیاب ہوئے اور تری پورہ ھی میں اس کا انتقال بھی ھوا تھا ۔ جیسا کہ پروفیسر علی احمد نے مخطوطات کی فہرست کے مقدمے میں لکھا ہے ' شیخ چاند کی قبر بھی تپرہ کے مقام '' بکسا،، میں موجود ہے ۔

شیخ چاند کے والد کا نام فتح محمد تھا اور ان کے پیر کا نام شاہ دولہ تھا ۔ جن کے متعلق خود شاعر نے لکھا ھے کہ کذبا ،

پرگنہ میں موضع پروا کے رہنے والے تھے۔ ان کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ ''اسباب معاش قلیل ہیں مگر شاگردان رشید کثیر''۔

لدبا پرگنہ اور موضع پروا' تپرہ کے لال مائی ریلوے اسٹیشن سے چار پانچ میل مغرب میں واقع ہیں۔ شاہ دولد کا مقبرہ بھی موضع پروا میں ہے۔ شیخ چاند کی قبر ''بکسا'' میں ہے جو پروا سے دکھن کی طرف ۴ یا ۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ شیخ چاند نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ شاہ دولد کا گھر پروا میں ہے لیکن '' ان کا بیشتر زمانہ '' بیت کارہ '' پرگنہ میں شاگردوں کو تعلیم دینے میں گذرتا رہا ''۔ اور یہ '' بیت کارہ '' پرگنہ بھی تپرہ ہی میں واقع ہے۔

شیخ چاند نے دنیا ترک کر رکھی تھی اور زیادہ تر مذہبی عبادتوں اور ریاضتوں میں وقت گذارتے اور شعر کہتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ '' رسول وجے ،، ہے۔ یہ کتاب ۱۲ سال میں مکمل ہوئی۔

شیخ چاند کے حالات تاریخ وار مرتب کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ان کی ایک نظم ،، قیامت نامہ ،، میں، جس کا ایک نسخہ پروفیسر علی احمد کو دستیاب ہوا ہے، صرف دوجگہ پر تاریخیں درج ہیں۔

بہرحال اگرچہ اس بات پر رائیں مختلف ہوسکتی ہیں لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ ، قیامت نامہ ، تپرہ کی مقامی تاریخوں کے لحاظ سے ۱۰۲۲ یعنی ۱۶۱۲ء میں مکمل ہوا۔ اور اسطرح یہ کہا جاسکتا ہے کے یہ شاعر سولھویں صدی کے اواخر یا سترھویں صدی کے اوائل میں گذرا ہے۔

اس وقت تک شیخ چاند کے پانچ ادب پارے دستیاب ہوسکے ہیں ، اور وہ یہ ہیں:—

(۱) "رسول وجے": یہ شیخ چاند کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ یہ شاہ دولہ کی ہدایت پر مرتب کیا گیا اور شیخ چاند نے خود لکھا ہے کے ان پنچالیوں کو فارسی کتاب "قصص الانبیا" کے مضامین سے مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب کے نصف آخر کا ، یعنی باب ۱۱۶ کے بعد کا بشیتر حصہ "شب معراج" سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ ایک باب "خجالت ابلیس" ہے۔ دوسرے ابواب کے عنوانات ہیں "قتل طالب"، "مبارز کی بیوی کی سزا"، "ایک گھوسی کا ایمان لانا"، وغیرہ۔

(ب) "شاہ دولہ": اسے ایک مکمل سوانح عمری تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اسمیں شاعر نے اپنے پیر شاہ دولہ کے کچھ حالات و ملفوظات لکھے ہیں۔ یہ کتاب سوال جواب کے پیرائے

میں لکھی گئی ہے - اس کا موضوع بیشتر تصوف ہے - مرید نے اپنے پیر سے کچھ سوالات سلوک اور تصوف کے مسائل پر کئے ہیں اور پیر نے جو جوابات دئے ہیں، وہ بھی سوالات کے ساتھ درج کردئے گئے ہیں -

اس کتاب کا ایک پرانا مطبوعہ نسخہ بھی ہے جو "بڑتلا" سے چھپا تھا -

(ج) "قیامت نامہ": یہ کتاب، جیسا کہ عنوان ہی سے ظاہر ہے یوم حشر کے موضوع پر ہے - اسمیں سنہ ۱۰۲۲ سال تیرہ، تالیف کی تاریخ دی گئی ہے -

(د) "ہرا گوڑی سنگباد": یہ تیرہ صفحہ کا ایک کتابچہ ہے جسمیں یوگیوں کے آسنوں کی تفصیلات دی گئی ہیں جو اس زمانے کے صوفی فقیروں میں بھی رائج تھے -

(ہ) "طالب نامہ": یہ نظم ونثر کا ملاجلا مجموعہ ہے - کچھ نظم اور کچھ نثر- موضوع کے اعتبار سے "شاہ دولہ" جیسی تصنیف ہے مگر اسکی بڑی قدر اسی لئے ہے کے بنگلہ زبان میں صوفیانہ موضوع پر نثر کے بہت ابتدائی اور قدیم نمونے اس میں پائے جاتے ہیں -

سید محمد اکبر: ہمارا خیال ہے کہ سید محمد اکبر (۱۶۵۷ء تا ۱۷۲۰ء) اکبر بھی نری بوزہ ہی کا شاعر

تھا کیونکہ اس کے بھی تمام مخطوطات وھیں سے دستیاب ھوئے ھیں۔ سوائے "زیب الملک شمع رخ" کے جس کا کوئی قلمی نسخہ ابھی تک کہیں اور سے نہیں مل سکا۔ آج سے کوئی چالیس سال قبل کلکتہ کے ادارے "بڑتلہ" نے اس کا ایک ایڈیشن شایع کیا تھا اور وہ بھی بہت مقبول ھوا۔ لیکن اس کتاب کے ماخذ کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ البتہ سید محمد اکبر کو فارسی میں کافی دستگاہ تھی۔

ایک موقع پر مثنوی کی ھیروئن کی قلمی تصویر کھینچتے کھینچتے، شاعر گریز اختیار کرتا ھے اور اپنے متعلق کہتا ھے کہ اس نے یہ کہانی "کلا ودھا" عمر' یعنی ١٦ برس کی عمر میں لکھی ھے اور وہ فارسی میں اس سے بہتر طریقے سے لکھ سکتا ھے۔ فارسی قطعۂ تاریخ کی رو سے اس مثنوی کی تاریخ تصنیف ١٠٨۴ھ یا ١٦٧٣ء ھے۔ اگر اس وقت شاعر کی عمر ١٦ سال تسلیم کرلی جائے تو اس کے یہ معنے ھوئے کہ وہ ١٦٥٧ع میں یعنی جنگ پلاسی سے ایک سو سال قبل پیدا ھوا تھا۔

شکر محمد: کافی قرائن ایسے موجود ھیں جن سے معلوم ھوتا ھے کہ یہ شاعر (١٦٨٠ء تا ١٧٥٠ء)

بھی تری پورہ کا تھا اور جنگ پلاسی سے قبل کے زمانے کا تھا ۔ اس کی نظم ” مینا مترگان “ کو حال ھی میں مرتب کرکے شایع بھی کر دیا گیا ھے یہ اوائل اٹھارویں صدی میں لکھی گئی تھی اور مشہور تاریخی واقعہ ، تری پورہ کے راجہ گوپی چندرا اور اس کی رانی مینامتی کا معاشقہ اس نظم کا موضوع ھے ۔

محمد رفیع الدین: نظم ”زیب الملک شمع رخ “ اسی کی تصنیف ھے ۔ اسکی اس نظم سے جو خاندانی حالات معلوم ھوئے ان سے پتہ چلتا ھے کہ شاعر کے والد کا نام اشرف تھا اور وہ کومیلا کے موضع نرائنا میں پیدا ھوا تھا ۔ اس نظم میں محمد خاں کی کہانی ” زیب الملک “ کو ایک نئے طرز سے پیش کیا گیا ھے ۔ لیکن رفیع الدین کا طرز نگارش زیادہ ستھرا اور بہتر ھے ۔

ھمارا اندازہ یہ ھے کہ یہ شاعر اواخر سترھویں صدی یا اوائل اٹھارویں صدی کا ھے۔

شیخ سعدی: اس کی نظم کا عنوان ”گدا ملکہ“ ھے۔ (۱۷۱۲ء) یہ ملکہ روم کی شہزادی تھی اور بہت با سلیقہ ، ھنر مند اور عالم فاضل ۔ اس نے اعلان کیا

تھا کہ وہ اُس شخص سے شادی کرے گی جو اس کے ایک ہزار سوالوں کا جواب دیدے گا ۔ اس دور کے تمام شہزادے اس معیار پر ناکام اترے۔ بالاخر ایک گدائے بے نوا ، عبداللہ نامی نے جوابات دینے کی ہمت کی اور کامیاب ہوا اور شہزادی کی شادی اس کے ساتھ ہوگئی ۔

یہ نظم ۱۱۲۲ میں (یعنی تری پورہ کے سنہ کے حساب سے) لکھی گئی جو ۱۷۱۲ء کے مطابق ہوتا ہے ۔

شیر باز : اس کی دونوں نظموں کے مخطوطے تری پورہ میں ملے ہیں ۔ اسکی نظمیں ہیں "قاسم کی جنگ" اور "فاطمہ کا صورت نامہ" ۔ شاعر شیخ سعدی کے پلے کا ہے بلکہ فن کے لحاظ سے اُس سے بہتر شاعر ہے ۔ "گدا ملکہ" اسکی بھی ایک کتاب کا نام ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ کتاب شیخ سعدی کی نظم پڑھنے کے بعد لکھی ہے ۔ شیخ سعدی اس سے کم پایہ کا شاعر تھا ۔ شیر باز نے ملکہ کی ہمجولیوں وغیرہ کے جو نام رکھے ہیں اُن سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاعر شیخ سعدی سے بلند پایہ شاعر ہے اور عبداللہ کی کامیابی پر شیر باز نے جو رائے زنی کی ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے ۔ کہتا ہے :

"وہ جو زمین پر سونے کا عادی تھا

اب ایک اور ھی بستر پر سونے جارھا ھے

اسکو قسمت کہتے ھیں

دیکھو عبداللہ شاہ روم بن گیا ! "

"قاسم کی جنگ" یا "معرکہ قاسم" "سن واقعہ کربلا" درج کیا گیا ھے -

"فاطمہ کا صورت نامہ" البتہ اپنی نوعیت کی بڑی ھی عجیب کتاب ھے - خصوصاً اس لئے کہ ایک مسلمان کے قلم سے لکھی گئی ھے - اس میں حضرت فاطمہ کو گویا ایک ہندو دیوی کی مانند دکھایا گیا ھے !

محمد عبدالرزاق : (۱۷۷۰ء) یہ شاعر نواکھالی کے پرگنہ بیدار آباد سے تعلق رکھتا ھے - اور تری پورہ کے راجہ ، مہاراج شری ولارہ مانکیا کے عہد میں گذرا تھا جو مہاراج کرشنا مانکیا (۱۷۶۰ء تا ۱۷۸۳ء) کا ایک حریف تھا -

اس کی بیانیہ نظم "سیف الملک ولال بانو" ۱۷۷۰ء کے لگ بھگ لکھی گئی تھی -

باب ششم

بنگلہ ادب عہد مغلیہ میں

(۱۵۷۵ء سے ۱۷۵۷ء تک)

خلاصہ

عہد مغلیہ کے بنگالی ادب کے مطالعہ سے اس کے تنوع اور خیالات کی گہرائی کی بنا پر ہر شخص متاثر ہوتا ھے - عہد وسطیٰ کے مقابلے میں اس دور کا ادب یقیناً ترقی یافتہ تھا - ترقی ' خارجی محرکات کی به نسبت داخلی ارتقا کا نتیجہ تھی - لیکن نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ فارسی ادب سے قریبی تعلق نے اس کی رفتار ترقی کو اور تیز کردیا تھا - مسلمانوں کی تصانیف میں فطری طور پر فارسی کا اثر نمایاں تھا - اس کے برخلاف جب انگریزی کی وساطت سے مغربی اثرات بنگالی ادب پر مرتسم ہوئے تو ان سے صرف ہندوؤں نے فائدہ اٹھایا - ذیل کی سطور میں اس کا اجمالی جائزہ لیا گیا ھے -

فقہ اسلام: مغلوں کے دور حکومت کے بنگالی ادب کا بڑا حصہ فقۂ اسلامی کے متعلق تصانیف پر مشتمل

ہے۔ اس میں زیادہ تر "رسالے"، ہیں۔ لیکن چند ضخیم تصانیف بھی ہم تک پہنچی ہیں۔ سید سلطان نے "شب معراج" میں ایسے علما کو برا بھلا کہا ہے جو عوام کو تعلیم دینے سے گریز کرتے ہیں اور ان پر آسمانی عذاب کے موجب ہوتے ہیں اس سے اس زمانہ کے رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔

اس زمانہ کی بیشتر مذہبی تصانیف عربی یا فارسی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں۔ "کفایت المصلین" (از شیخ مطلب) "شہاب الدین نامہ" (از عبدالحکیم)، "ہتاجنن وانی" از حیات محمود اور "شریعت نامہ" از نصراللہ خاں، کافی ضخیم خلاصے کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مندرجہ ذیل مصنفین کے متعلق بھی یہی بات با وثوق طور پر کہی جاسکتی ہے۔ ان میں سے اکثر کا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے:

"نصیحت نامہ"، از شیخ پران۔ "موسا رسوال"، از نصراللہ خاں "شریعت نامہ"، از نصراللہ خاں۔ "کفایت المصلین"، از شیخ مطلب "ہدایت الاسلام"، از نصراللہ خاں۔ "نصیحت نامہ"، از عبدالحکیم "بیانات"، از نوازش خاں۔ "سرسانیر نیتی" از قمر علی "مناجات"، از محمد فصیح۔ "نماز مہاتمیا"، (فوائد نماز)

از محمد خاں - " شہاب الدین نامہ " از عبدالحکیم
" ھتا جنن وانی " (ہدایت العوام) از حیات محمود -

۲ - قصص اسلامی : دوسری قسم فرضی یا نیم تاریخی
عام پسند قصوں پر مشتمل ہے - یہ گویا مسلمانوں کے ہاں
ہندو اساطیر کا جواب تھے - گو ان کے لکھنے کا خیال ہندو
دیومالا کو دیکھ کر ہی پیدا ہوا تھا لیکن ان قصوں کے متعلق
یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ انہوں نے بنگال میں اسلامی
کلچر رائج کرنے میں بڑی مدد دی اور اسے گھر گھر پہونچایا -
یہ فرضی اور خیالی قصے باوجود اپنی ضخامت کے کافی مقبول
تھے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں :- " نوی بنگشا "
(سلسلۂ انبیا) " رسول وجے " (مغازیٔ رسول) " شب
معراج " - " وفات رسول " اور " ابلیس نامہ " از سید سلطان -
" حنیفر لڑائی " (یعنی جنگ نامہ محمد حنیف) از محمد خاں -
" امیر حمزہ " از عبد البنی - " جنگ نامہ " (رسول وجے) -
" انبیاء وانی " (یعنی پیغامات انبیاء) از محمد خاں -

تخلیق کائنات کا اسلامی نظریہ : اسلامی
طرز کے قصوں میں سے بعض اسلامی نظریۂ تخلیق سے تعلق

رکھتی ھیں۔ ان میں بیشتر بنیادی طور پر اگرچہ اساطیری انداز کے ھیں، لیکن اس کے باجود اسی قسم کے آن قصوں سے مختلف ھیں جو دوسرے ملکوں میں لکھے گئے ھیں۔ اس نوعیت کی قابل ذکر کتابوں میں شیخ پران، میر محمد شفیع اور عبدالحکیم کے "نور نامے"، اور میر محمد شفیع کی "نور قندیل" شامل ھیں۔

(د) اسلامی فلسفہ اور تصوف: اس زمانے کا اسلامی فلسفہ صوفیانہ خیالات پر مبنی تھا۔ جس کی ابتدا ایران، بخارا اور سمرقند میں ھوئی تھی۔ فارسی پر صوفیانہ ادب چھایا ھوا ھے۔ بنگالی نے بھی یہ صوفیانہ خیالات فارسی ھی کی وساطت سے حاصل کئے۔ پھر یوگی طریقے بھی ان میں خلط ملط ھوگئے۔ مگر اس اختلاط سے جو ادب وجود میں آیا اسے "یوگ قلندر" ادب کا نام دیا جاتا ھے۔ اس سلسلہ کی اہم ترین کتابوں کے نام یہ ھیں:-

"جیون چوتیشا اور جنن جیون پرادیپ" (چراغ زندگی) از سید سلطان، نور جمال از حاجی محمد، سر نامہ از شیخ منصور یوگ قلندر از سید مرتضیٰ، چاری مقام بھید از عبدالحکیم۔

فارسی کی طرح بنگالی ادب میں بھی صوفیانہ طریق اظہار

کی دو شاخیں ھیں یعنی ,, عملیات ‘‘ اور ,, غزلیات ‘‘ ۔ مندرجہ بالا کتابیں وہ ھیں جو صوفی عملیات سے تعلق رکھتی ھیں ۔ ’’ پداولیوں ‘‘ کو غزلیات کے مترادف سمجھا جاسکتا ھے ۔ گو یہ ظاھر ھے کہ جن مصنفوں نے ’’یوگ قلندر ،، کے موضوع پر کتابیں لکھیں انھوں نے ’’ پداولیاں ‘‘ بھی تصنیف کی تھیں ۔

(ز) مسلمانوں کے رومانی قصے : اس صنف ادب نے مسلمانوں کی فطری صلاحیتوں کے اظہار کے لئے وسیع میدان مہیا کیا، اور مسلمانوں نے بنگالی ادب میں بعض نہایت عمدہ افسانے لکھے ۔ یہ رومانی قصے غالباً فارسی عشقیہ افسانوں کے لطیف اور فنکارانہ طرز ادا سے متاثر تھے ۔ اور اسی لئے ان میں وہ حسن اور نزاکت پائی جاتی ھے جو دوسری شاعرانہ تصانیف میں مفقود ھے ۔ ھندوؤں کے قلم سے لکھی ھوئی ایک نظم بھی طرزبیان کی خوبصورتی کے اعتبار سے مذکورہ نظموں کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر کتابیں یہ ھیں :۔

یوسف زلیخا از عبدالحکیم، یوسف زلیخا از غریب اللہ و یعقوب، لال متی سیف الملک از عبدالحکیم، گل بکاؤلی از نوازش خاں، زیب الملک شمع از سید محمد اکبر شاہ جلال مدھو مالا از منگل چاند اور گدا ملکہ از شیخ سعدی ۔

(س) مراثی : عہد مغلیہ میں شیعہ حضرات کے بنگال میں آباد ہونے اور وہاں مسلک شیعہ کے پھیلنے کی وجہ سے مرثیہ لکھنے کا رواج شروع ہوا۔ اس زمانے سے قبل بنگالی ادب میں مرثیئے قطعا مفقود تھے۔ شیخ فیض اللہ کا جینبر چوتیشا'' اس قسم کے ادب کی قدیم ترین مثال ہے لیکن اس میں افسانوی عنصر موجود نہیں۔ یہ محض ایک ماتمی نظم ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی مشتبہ ہے کہ آیا ''جینبر چوتیشا،، شیخ فضل اللہ کی تصنیف ہے بھی یا نہیں ''گورکھا وجے،، (گورکھے کی فتح) — ,,غازی وجے'' (فتح غازی) اور 'ستیا پیر' (سچا پیر) بھی شیخ فضل اللہ کی تصانیف سے ہیں۔ مرثیوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں:—

''مقتول حسین'' از محمد خاں — کار والا از عبدالحکیم
''مقتول حسین'' یا ''جنگ نامہ'' از غریب اللہ و یعقوب۔
اور ''محرم پروا'' از حیات محمود۔

(ش) **تاریخی نظمیں**: بنگال میں تاریخ کی سب سے پہلی کتاب بھی ایک مشہور مسلمان مورخ نے ہی لکھی تھی۔ اس زمانے میں جتنی تاریخیں لکھی گئیں ان میں سے چند نہ صرف بحیثیت تاریخ قابل ذکر ہیں بلکہ ادبی اعتبار سے بھی ان کا پایہ بلند ہے۔ تاریخی کتابوں میں نوازش خاں کی ''پلئن پرانگنتا،،

(رجز) اور جور آور سینہ کیرتی (زور آور سنگھ کے کارنامے) اور
وزیر علی کی "شاھنامہ" (اسلام آباد) بہت اھم تصور کی جاتی ھیں۔

(ص) الیگری: تمام ھندو اور مسلمان مصنفین میں
محمد خاں پہلا شخص تھا جسنے سب سے پہلے الیگری نظم "مجازیہ" لکھی۔ اس نظم کا عنوان "ستیا کلی وواد سنگباد" (حق و باطل کی جنگ کا بیان) ھے۔ یہاں ستیا اور کلی دونوں مثالی علامتیں ھیں۔ جن سے نظم ھندو نژاد سی معلوم ھوتی ھے۔ لیکن یہ علامات شاعر نے بدی پر سچائی یا مذھب کی فتح کا حال بیان کرنے کے لئے استعمال کی ھیں۔ اس موقع پر قرآن کریم کی اس مشہور آیت کی طرف خیال جاتا ھے جس کا مفہوم ھے کہ حق آخر کار ظاھر ھوجاتا ھے اور باطل نابود ھوجاتا ھے بیشک باطل نابود ھونے کیلئے ھی ھے۔ (جاءالحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا)۔ ملک محمد جائسی کی "پدماوت" کی طرح یہ بھی ایک مجازیہ (الیگری) ھے اور اس میں جو نام علامتی طور پر استعمال کئے گئے ان کے ھندوانہ یا اسلامی ھونے سے چنداں فرق نہیں پڑتا۔

(ط) پداولیاں: ھم پہلے بیان کرچکے ھیں کہ "علم تصوف" یا فسفہ صوفیا کی ادب میں دو صورتیں ھوتی ھیں۔

یعنی ''عمل'' اور ''غزل''۔ ایرانی اور ہندوستانی صوفیوں میں سے کچھ لوگوں نے تو صوفیانہ خیالات وعظ اور خطبے کے طور پر بیان کئے ہیں مگر کچھ لوگوں نے ان خیالات کو گیتوں کا جامہ پہنایا ہے۔ بنگال کا صوفی ادب بھی اسی قسم کا ہے۔ ''پداولیوں'' کو ہم غزل کے مترادف تصور کرسکتے ہیں۔ جسطرح سید سلطان کا ''جیون پرادیپ'' (چراغ زندگی) اور سید مرتضیٰ کا ''یوگ قلندر''۔ یہ بنیادی طور پر مکالماتی ہیں، اگرچہ ان شاعروں نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔ شاہ اکبر، نصیر محمود، سال بیگ (صالح بیگ) کبیر اور قمر علی، پداولیاں لکھنے والوں کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔

(ع) متفرقات: صوفیانہ یا معرفتی گیت جو بنگال میں لکھے گئے متعدد جلدوں میں یکجا کر دئے گئے ہیں، مثلاً ''راگ مالا'' اور ''دھیان مالا''۔ مندرجہ بالا اصناف ادب کے علاوہ ہمیں کچھ اور کتابیں علم نجوم پر بھی ملتی ہیں۔ مثلاً محمد شفیع کی ''ساعت نامہ'' اور ایک دو دوسری کتابیں جنمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب کے مشترک عناصر ملتے ہیں جیسے غریب اللہ کی ''ستیا پیر'' (سچا پیر)۔

حصۂ پنجم

برطانوی عہد میں مسلم بنگالی ادب

(۱۷۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک)

باب اول

سیاسی و تہذیبی پس منظر

۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں برطانیہ کے ہاتھوں نواب سراج الدولہ کی شکست تاریخ کا ایک بڑا اھم سانحہ ھے۔ اس شکست نے بنگال میں مسلم اقتدار پر کاری ضرب لگائی اور اس طرح نہ صرف مسلم عوام صعوبتوں میں مبتلا ھوئے بلکہ رفتہ رفتہ دیر اثر زھر کی طرح وہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے بالکل تباہ بھی ھوگئے۔ ھم یہاں مختصر طور پر اس المناک تاریخ کے حقائق بیان کریں گے۔

اگرچہ سراج الدولہ کی شکست کے بعد میر جعفر کو بنگال کا برائے نام نواب بنا دیا گیا تھا لیکن اصل اختیارات کلایو کے ھاتھوں ھی میں تھے۔ ۱۷۶۴ء میں 'جریا' 'ادے نالہ' اور "باقر" کے مقامات پر میر قاسم کی تابڑ توڑ شکستوں کے بعد بنگال میں مسلم اقتدار کا آخری چراغ بھی گل ھو گیا۔ شہنشاہ ملک، شاہ عالم (دھلی) سے اس وعدے پر کہ ان کو سالانہ

۲۶ لاکھ روپیے کی مالگذاری ملتی رھے کی کلائو نے
بنگال ، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرلی ۔ اور اب
جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی عسکری لحاظ سے مضبوط ھوچکی تھی
ملک کی باگ دوڑ آئینی طور پر اس کے ھاتھوں میں آگئی
اور اس طرح یہاں دو عملی حکومت کا آغاز ھوتا ھے ۔ بنگال
اور بہار کیلئے محمد رضا خاں اور شتاب رائے کو علی الترتیب
نائب دیوان مقرر کیا گیا ۔ انکے ھاتھوں ملک میں قحط اور
کال کی ایسی بھیانک وبا پھوٹ پڑی کہ بنگالی زبان میں
اس کو ''چھیتریرسنتر،، یا سال '۷۶' کا المیہ کہا جاتا
ھے ۔ (بنگالی سال ۱۱۷۶ مطابق سن عیسوی ۱۷۶۹) ۔ فاقہ کشی
اور وباؤں سے آبادی کا ایک تہائی حصہ ختم ھوگیا ۔
آج بھی اھل بنگال کو یہ المیہ یاد ھے اور '۷۶' منحوس عدد
شمار ھوتا ھے ۔ اکثر و بیشتر اس کو تنبیہ کے طور پر لفافوں
پر بھی لکھدیا جاتا ھے جس کا مطلب یہ ھوتا ھے کہ اصل مکتوب
الیہ کی بجائے اگر کسی اور شخص نے لفافہ کو کھولا تو
تو '۷۶' کے قحط میں لاکھوں مرنے والے اس پر لعنت
بھیجیں گے ۔ ۱۷۷۲ء سے ۱۷۹۳ء یعنی لارڈ ھیسٹنگز اور
لارڈ کارنوالس کے عہد گورنر جنرلی میں انگریزوں نے بنگال

میں متعدد ضابطے نافذ کئے ۔ اس عہد کے آغاز ہی میں
بنگال کا دارالحکومت مرشد آباد سے کلکتہ منتقل کر دیا گیا
تھا ۔ نواب تباہ کر دئے گئے اور ۱۷۹۳ میں بندوبست
دوامی نافذ کیا گیا جس کی وجہ سے بنگالی مسلمانوں کی
مصیبتیں اور بڑھ گئیں ۔

۱۸۳۶ء میں فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے ختم
کر دیا گیا لیکن مسلمان اس تبدیلی سے مطمئن نہ
ہوسکتے تھے ۔

برطانیہ نے چالیس سال پہلے بنگال میں انگریزی تعلیم
نافذ کر دی تھی ۔ اس کے کرتا دھرتا چارلس گرانٹ تھے ۔
لیکن اس مسئلے میں کامیابی دراصل عیسائی مشنریوں کی وجہ
سے ہوئی ۔ اس ملک میں انگریزی تعلیم کی ابتدا میں ولیم
کیری کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے ۔ یہ ۱۷۹۳ء میں
کلکتہ آئے اور "سری رامپور" کی مشنری جماعت میں شامل
ہوگئے ۔ ان ہی کی کوششوں سے وہاں ایک انگریزی
اسکول کی بنیاد پڑی اور بنگالی میں انجیل کا ترجمہ بھی ان ہی
کی بدولت ہوا ۔ یہ ترجمہ سری رامپور ہی میں چھپا ۔ ان
کے بعد "ڈیوڈ ہیئر" اور راجہ رام موہن رائے سامنے آئے ۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑی اور ۱۸۲۳ء
میں تعلیم عامہ کی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا ۔ اینڈو
سنسکرت کالج کا قیام بھی اسی کمیٹی کی کوششوں ن
نتیجہ تھا ۔ اس طرح رفتہ رفتہ ملک میں انگریزی تعلیم
پھیلتی گئی اور فارسی کو پس پشت ڈال دیا گیا ۔ ایک طرف
اگر ھندوؤں نے نئی انگریزی تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھایا
تو دوسری طرف مسلمان فخریہ اندازمیں اس سے دور دور رہے
کیونکہ اس غیر ملکی زبان سے ان کو کوئی لگاؤ نہ تھا ۔

مسلمانوں کے ھاتھوں سے جب ان کی حکومت ، ان
کا اقتدار' ان کا وقار حتیٰ کہ ان کی زبان بھی نکل
گئی تو اب عیسائی مشنریوں کی طرف سے آنہیں اپنا مذھب بھی
خطرہ میں گھرا ھوا نظر آیا ۔ لیکن ظاھر تھا اتنی آسانی سے وہ
اپنے نصب العین کو کیسے چھوڑ سکتے تھے ۔ انتظامی اور
سماجی ڈھانچے میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے
سیاسی اقتدار میں جب استحکام اور توسیع آگئی تو مسلمانوں
کے اندر بھی نئے ولولے بیدار ھوئے ۔ وھابی تحریک کی شکل میں
ایک نئی سیاسی مذھبی سرجوشی کی ابتدا ھوئی ۔ اس تحریک نے
جلد ھی اپنے لئے زمین ھموار کرلی ۔ '' بارہ مت سب ڈویژن ''

"چوبیس پرگنہ" کے ایک مجاھد، میر نثار علی عرف تیتو میر نے اس میں نمایاں حصہ لیا - "بانس باریہ" کے علاقہ میں بانس کے بنے ہوئے ایک قلعہ میں انگریزوں سے ان کی جنگ ہوئی، اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے - ان کی شہادت کے بعد ان کے پیر دادو میاں فرید پور والے نے ۱۸۴۷ء میں انگریزوں کے ناقابل برداشت مصائب جھیل کر جام شہادت نوش کیا لیکن، ان ساری باتوں کے باوجود برطانوی دھشت پسندی سے بنگالی مسلمانوں کا سر نہیں جھکا - ان کے سینے میں ۱۸۵۷ء کے آخر تک بے اطمینانی کی آگ بھڑکتی رھی جس کا قدرتی نتیجہ یہ ھوا کہ ان پر سے برطانیہ کا اعتماد اٹھ گیا اور اس کی خوشی نا خوشی میں بدل گئی -

برطانوی عملداری میں بنگالی مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ھیں اگر کسی کو ان مظالم کی جھلک دیکھنی ھو تو ھنٹر کی کتاب "انڈین مسلمان" موجود ھے - یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں چھپی تھی - ھندوستان میں برطانوی پالیسی پر صاف صاف نکتہ چینی کرتے ھوئے برطانوی مصنف نے اس بات کی مذمت کی ھے کہ جنگ پلاسی کے بعد سے ابتک یعنی ۱۲۵ سال تک ھندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ

قطعی نامنصفانہ رہا ہے۔ انہیں روٹی کپڑے تک سے محروم رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، بقول ہنٹر، برطانیہ کی غیر دانشمندانہ پالیسی ہی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی مسلمان قوم تباہ و برباد ہوگئی۔

ہنٹر کی تحریر کے بموجب بنگال میں مسلم امرا کا طبقہ گذران کے لئے تین پیشوں پر انحصار رکھتا تھا یعنی فوج کے اعلیٰ عہدے، مالیات اور عدلیہ کے عہدے اور سفارتی یا سیاسی منصب۔ لیکن مسلمانوں کو نہ صرف فوج میں لینے سے انکار کر دیا گیا بلکہ ان کے لئے دیوانی کے دروازے بھی بند کر دئے گئے کیونکہ انگریز خود سارے انتظامی عہدوں پر اور ہندو ساری کلرکی کی آسامیوں پر قابض تھے۔ اگرچہ سیاسی یا عدالتی عہدوں پر مسلمانوں کا حق فائق تھا، لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی ان کو فائز نہیں کیا گیا۔

ہنٹر نے آگے چل کر لکھا ہے کہ مسلمانوں نے انگریزی پڑھنے سے اسلئے انکار کر دیا کہ وہ نہ صرف ملک کے سارے امور فارسی زبان میں اپنی پوری لیاقت سے انجام دیتے تھے بلکہ ان میں ذہین و فطین ناظم بھی تھے۔ لیکن فارسی کی بجائے انگریزی کے رواج سے ہندوؤں کے لئے کوئی فرق نہیں

پڑا ۔ کیونکہ جس طرح وہ مسلم دور حکومت میں فارسی پڑھا کرتے تھے اب انگریزی عملداری میں بڑی خوشی سے انگریزی زبان سیکھنے لگے۔

ہنٹر نے ایسی اور بہت ساری باتیں لکھی ہیں ۔ انہوں نے مسلمانوں کی ابتر حالت کا ذمہ دار بجا طور پر مسلمانوں ہی کو ٹھہرایا ہے کیونکہ ان کی غیر دانشمندانہ پالیسی نے مسلمانوں کو کہیں کا نہ رکھا۔

۱۸۷۱ء کے بعد بھی مسلمانوں پر سختیاں جاری رہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے انگریزوں کے ان شبہات پر کہ مسلمان وفادار ہوسکتے ہیں مہرثبت کردی اور اس طرح مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی دونوں حیثیتوں سے کچل دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا ۔ انیسویں صدی کے اختتام تک مسلمانوں کے اندر سیاسی زندگی کی ذرا بھی علامت نظر نہ آتی تھی بہر حال ان کے جذبات کتنے ہی خوابیدہ کیوں نہ رہے ہوں ، وقت نے ثابت کر دکھایا کہ انہیں مٹایا نہیں جاسکتا ۔ جب انہیں اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ برطانیہ کے امتیازی سلوک اور ہندوؤں کی سرپرستی کی وجہ سے ہندو زندگی کے ہر شعبے میں ان سے سبقت لے جاچکے ہیں تو انہوں نے تقسیم

تنسیخ بنگال کا مطالبہ کردیا ۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں بنگال کی تنسیخ ہوگئی ۔ ۱۸۵۷ء کی جد و جہد کے بعد سے ہندوستان میں مسلم احیاء کی یہ پہلی علامت تھی، لیکن جلد ہی مسلم آبادی کی خواہشوں اور مفادات کی قطعی پروا کئے بغیر بنگال کی تقسیم کو پھر ختم کر دیا گیا ۔

تب ہی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات زیادہ سے زیادہ اور کھلے طور پر ٹکراتے رہے یہاں تک کہ ملک تقسیم ہوگیا اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا ۔

انیسویں صدی تک انگریز مشرق کی تہذیبی زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی تو کیا کرتے خود اُن میں سے بیشتر نے فارسی اور عربی سیکھنی شروع کی اور ہندوستانی طرزِ معاشرت کو اپنایا ۔ پالکی کی سواری ' حقہ نوشی اور پان کی گلوریوں سے یہ خوب لطف اندوز ہوتے ۔ مختصر یہ کہ مسلمان امراء کے یہ مکمل نمونے نظر آتے تھے ۔ اس کے علاوہ ''بائی جی،، (طوائف) کے گانوں اور مغلئی دسترخوان کو بھی انھوں نے خوب پسند کیا ۔

ظاہرا انگریزوں نے مسلمانوں کے طرز معاشرت کو تو ترجیح دی تھی لیکن دراصل وہ ہندوؤں کی پشت پناہی کرتے

اور مسلمانوں کے خلاف انہیں سیاسی مہرے کے طور پر استعمال کرتے تھے - برطانوی حکومت نے ہندو تہواروں کی فیاضانہ سرپرستی کا بھی ثبوت دیا ہے - لیکن ۱۸۳۲ء سے ہندو تہواروں کی سرکاری سرپرستی ختم کردی گئی - بعض انگریزوں نے نہ صرف یاترا بھجنوں میں حصہ لیا ہے بلکہ انہوں نے یاترا کے گانے بھی لکھے ہیں -

انگریزی تعلیم کی اشاعت سے ملک کی تہذیبی زندگی پر ناگزیر اثر ہوا اور ۱۸۰۰ء میں کلکتہ فورٹ ولیم کالج کا قیام تو ہماری تہذیبی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے - اس وقت سے انگریزی تعلیم کہیں رکے بغیر ملک بھر میں پھیلتی گئی - ہندوؤں نے تو اس میں بڑی گرم جوشی دکھائی اور مسلمان نہ صرف اس سے بے توجہی برتتے رہے بلکہ اس امید میں کہ کھویا ہوا اقتدار پھر ہاتھ آجائے گا، وہابی تحریک اور ۱۸۵۷ء کی جدوجہد جیسی سیاسی تحریکوں میں کود پڑے - بدقسمتی سے اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ ہندو تیزی سے اور آگے بڑھ گئے اور مسلمانوں کا زور واثر رفتہ رفتہ سرد پڑتا گیا -

برطانیہ کی عملداری میں بنگالی ادب کی تاریخ سے

مسلمانوں کی ذہنی مدافعت خوب نمایاں ھے - نئی تبدیلیوں سے وہ ناخوش اور علیحدہ رھے۔ سنہ ۱۸۰۰ء بنگالی ادب کی تاریخ کیلئے ایک نشان راہ ھے کیونکہ اس سال کلکتہ فورٹ ولیم کالج قائم ھوا - اسی کالج سے ۱۸۲۵ء میں بنگالی نثر کی متعدد کتابیں شائع ھوئیں اور یہی در حقیقت بنگالی نثری ادب کی ابتدا ھے — ابتک اظہار جذبات کے لئے شاعری ھی ایک تسلیم شدہ ادبی ہیئت تھی لیکن مسلمان اب بھی شاعری کی روایت پر ریجھے ھوئے تھے - ھندوؤں نے نئی صنف کو اپنایا اور وہ ایسا نثری ادب پیدا کرنے میں کامیاب ھوئے جس میں مغربی خیالات کی آمیزش تھی - مغل روایات پر جان چھڑکنے والے آخری مسلمان ادیب چٹگام کے خان بہادر حمید اللہ ھیں - فارسی زبان میں ان کی تصنیف "تواریخ حمیدیہ" کے ساتھ ساتھ ان کی بنگالی تصنیفات "شہادت ادیان" (۱۸۶۳ء) اور "ترن پتھ" بہت مشہور ھیں -

۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء کے پورے عہد میں ایک طرف مسلمان روایتی ہیئت کو لئے بیٹھے رھے اور دوسری طرف ھندوؤں میں راجہ رام موھن رائے (وفات ۱۸۳۳ء) ایشور چندر ودیا ساگر اور اکشے کمار دت بہت پہلے ھی مغربی جذبات سے بنگالی

نثر کا دامن بھر چکے تھے - اور بنکم چندر (۱۸۹۴ - ۱۸۳۸) کی تخلیقی فطانت نے تو بنگالی ادب میں بنگالی نثر اور مغربی جذبات کو مستقل جگہ دیدی - انہی دنوں مسلمانوں نے نثر کی طرف سے اپنا روبہ بدلا - چنانچہ میر مشرف حسین (۱۸۴۸ – ۱۹۱۱) بنگالی کے پہلے مشہور و معروف مسلم نثر نگار پیدا ہوئے -

اوپر جو حقائق مختصراً بیان کئے گئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۱۷۵۷ء سے سنہ ۱۸۵۷ء یعنی ایک سو سال تک بنگالی مسلمان ادب میں صرف پرانی روایات پر تکیہ کئے رہے - ہم اس عہد کی ادبی تخلیق کو ادب عالیہ کی نقل کہہ سکتے ہیں - ان میں مغربی اثرات کی جھلک تک نہیں ہے - لیکن سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان نثری ہئیت کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتے گئے - سنہ ۱۸۶۹ء میں میر مشرف حسین نے 'رتناولی' کے نام سے ایک ناول لکھا - یہ وہ پہلا جدید قسم کا ناول ہے جسے کسی مسلمان مصنف نے لکھا - لہذا 'رتناولی' کی اشاعت کے بعد سے "مسلمانوں کی تحریروں" کو ہم "جدید ادبی رجحان" کہیں گے - اس پر ہم اگلے باب میں بحث کریں گے -

باب دوم

برطانوی عہد میں قدیم روایت

(۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ برطانوی عہد کے ایک سو سال تک مسلم بنگال کی تحریریں محض پرانے مصنفوں کی نقل ہوا کرتی تھیں۔ ان تحریروں میں جدت طبع کو ذرا بھی دخل نہ تھا لیکن فارسی ادب کا اثر بلا شبہ بڑا گہرا اور وسیع تھا۔ اس اثر سے عہد مغلیہ کے بعد کے ہندو بھی نہ بچ سکے لیکن زبان اب بھی مختلف تھی - یہی وجہ ہے کہ اس زبان کو ''مسلم بنگالی،، کا خطاب دیا گیا ۔ ہندو بھی عام طور پر اپنے شعر و ادب میں فارسی الفاظ اور محاورے استعمال کرتے تھے مگر ہم انکی زبان کو ''مسلم بنگالی،، نہیں کہہ سکتے تھے اور نہ اسے بھرت چندر کے لفظوں میں (دیکھئے ''من سنگھا کو...، ۱۷۵۲)''دو بھاشی بنگلہ'' (دو میل کی بنگلہ) ہی کہا جاسکتا تھا۔ بپرا داس بپلائی کی تصیف ''منسا منگل،، (۱۴۹۳ء)، نوی لنکن

کی تصنیف چاندی منگل (۱۵۷۶ء) اور گھن رام کی تصنیف دھرم منگل (۱۷۰۹ء) میں مسلم کردار بیان کرتے اور بنگال کی اسلامی زندگی اور تہذیب کا نقشہ کھینچنے کیلئے دو بھاشی طرز کو بڑی آزادی سے استعمال کیا گیا ہے۔

دوبھاشی بنگلہ یا مسلم بنگلہ برطانوی عہد ہی کی تخلیق ہے۔ یہ زبان جنوبی بنگال کے مسلمانوں کی، جو وہابی تحریک سے متاثر تھے' مشہور زبان تھی۔ ہنٹر کے الفاظ میں: آج تک ڈیلٹا کے کسان مسلمان ہی ہیں۔ نشیبی بنگال میں اسلام کی جڑ اتنی مضبوط تھی کہ وہاں مذہبی ادب پروان چڑھا اور ایک نئی بولی وجود میں آئی۔ مگر مسلم بنگالی جسے 'پتوا' بھی کہا جاتا ہے بالائی ہندوستان کی اردو سے اتنی ہی مختلف ہے جتنی ہرات کی فارسی سے شمالی ہند کی اردو۔

نشیبی بنگال سے ہنٹر کی مراد دراصل ہگلی' ہوڑہ ۲۴ پرگنہ کلکتہ، فریدپور، باقرگنج، بریسال اور جیسور ہے۔ تیتومیر (۱۸۳۱) اور دادو میاں (۱۸۷۴) اسی علاقے میں رہتے تھے۔ چنانچہ مذہبی اصلاح کے لئے ان کی تحریکیں وہابی اور

فرائضی تحریکوں کے نام سے مشہور ہیں- یہی علاقے ان سے زیادہ متاثر ہوئے - ان تحریکوں سے بہت پہلے بنگالی ہندو اپنی مادری زبان کی نشوونما میں سبقت لے جا چکے تھے - سیاسی وجوہات سے مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کا سلوک سوتیلی ماں کا سا رہا اور ہندو بنگالی ملکی زندگی میں زیادہ سے زیادہ اثر حاصل کرتے چلے گئے - مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں اور برطانیہ کی دشمنی نے نشیبی بنگال کے مسلمانوں کے اندر خصوصاً جداگانہ حیثیت کا احساس بیدار کیا اور اس طرح وہ اپنی زبان مین زیادہ سے زیادہ عربی ' فارسی اور اردو کے الفاظ بھرتے گئے - اس زبان کو وھابی اور فرائضی تحریکوں سے پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور اچھا خاصا مذھبی ادب پیدا ھوگیا - کلکتہ کی "بڑتلہ مطبوعات" نے ان کتابوں کو چھاپ کر اور شائع کرکے خوب پیسے کمائے- ایک عرصہ تک اونچے طبقہ کے بنگلی اس ادب کو بڑے فخریہ انداز میں "بڑتلہ مطبوعات" کہتے رھے اور آج بھی اس اصطلاح کو تحقیر کے طور پر استعمال کیا جاتا ھے -

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس باب میں ھم

جس روایتی ادب کا ذکر کررہے ھیں وہ مسلمانوں کی قدیم ادبی بنگالی میں لکھا گیا ھے - اس ادب میں قدیم ادب کی خصوصیات پائی جاتی ھیں اور اس کا عام تہذیبی نظریہ عہد مغلیہ کے دور کا ھے۔ اس دور کے ایک شاعر محمد رضا ھیں جو مغلیہ عہد کے آخری دنوں میں پیدا ھوئے تھے اور برطانوی عہد کی ابتدا تک حیات رھے (۱۶۹۱ — ۱۷۶۷) -

محمد رضا: (۱۶۹۱ — ۱۷۶۷): اس شاعر کی زندگی اس عبوری دور میں گذری جبکہ برطانیہ کے ھاتھوں میں مغلیہ اقتدار آرھاتھا - تقریباً بیس سال پہلے چاٹگام سے شائع ھونے والے ''ستیا ورتا'' میں' (جواب بند ھوچکا ھے)' اس شاعر پر ایک مضمون چھپا تھا جس سے پتہ چلتا ھے کہ وہ اسی ضلع کے موضع بخت پور کے (جو فتح کیھاری تھانہ میں واقع ھے) رھنے والے تھے۔ آج بھی ان کی اولاد کا شمار با اثر لوگوں میں ھوتا ھے۔ خاندانی روایت کی رو سے شاعر کی پیدائش ۱۶۹۱ء اور وفات ۱۷۶۷ء میں ھوئی۔ ان کی شہرت صرف ان کے ضلع تک ھی محدود نہ رھی بلکہ ان کی مشہور تصنیف '' تمیم جلال '' جو 'بڑتلہ' نے چھاپی تھی' بنگال کے تقریباً ھر گھر میں پہنچی۔ ''تمیم جلال'' بیانیہ نظم ھے۔ اس کا عنوان اصل میں ''تمیم

جلال اور چتورنا چیلال" ہے - اس میں مغل شہزادے تمیم جلال اور شیرازی شہزادی چتورنا چیلال کے عشق و محبت کا بیان ہے - ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کو خواب میں دیکھتے ہیں اور اس اُمید میں کہ ملاقات ابدی دنیا میں ہوگی اپنے کو نذر آتش کردیتے ہیں - گاندھروا رواج کے مطابق ان کی شادی خواب میں ہوجاتی ہے لیکن سوال ملاقات کرنے کا پیدا ہوتا ہے:

"رات کے وقت جلال کے گلے میں پھولوں کا ہار پہنانے
کیلئے لڑکی دن بھر پھول چنتی ہے
لیکن جس کے لئے وہ تکلیف اٹھارہی ہے وہ نظر نہیں
آتا - پھر یہ ہار کس کام کے ؟"

شاہ شیراز کو جب اس عشق کی کیفیت معلوم ہوئی تو اس نے اس کی شادی کا منصوبہ باندھا - اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے سوئمبر کی رسم منائی گئی - دور دراز ملکوں سے جو شہزادے اس سوئمبر میں شرکت کے لئے آئے تھے ان میں جلال بھی شامل تھا - آزمائش یہ رکھی گئی تھی کہ شہزادے ایک منھ زور گھوڑے پر بیٹھ کر پہلے تو اس چیتے کو ہلاک

کرتی ہے جس نے شیراز میں تباہی مچا رکھی تھی بہرام
شیراز کی آدم خور دیونی کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اس
کے بعد '' بالا مترا '' دیو کو گرفتار کر کے زنجیروں میں جکڑ
لیتے ہیں اور دیو راج کو تاخت و تاراج کردیتے ہیں۔
تمیم جلال آزمائش میں پورا اترا اور چتورنا چیلال کو
حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد دونوں کی زندگی
ہنسی خوشی گذری۔

'' مصری جمال '' ان کی دوسری عشقیہ نظم ہے۔
اس میں 'کاروار' کے شاہ عبدالکریم کی بیٹی اور شہر بدل کے شاہ
شریف سلطان کے بیٹے تراب ھمیم کے عشقیہ کارنامے بیان کئے
گئے ہیں۔ تصویر دیکھکر ہی دونوں ایک دوسرے کی محبت
میں مبتلا ہوتے ہیں اور بڑی جان جوکھم کے بعد دونوں
کی شادی ہوتی ہے۔

کہانی کے طور پر دیکھئے تو ان نظموں میں کوئی خاص
بات نہیں لیکن ان کے اندر دو امتیازی خصوصیات ہیں۔ اول
یہ کہ ان میں پہلی نظموں کی طرح طویل مناجات نہیں ہے'
شاعر نے صرف دو مصرعوں میں مناجات ختم کردی ہے۔ دوم
یہ کہ انہوں نے تخلص کے استعمال میں جدت پیدا

کی ہے یعنی آخری شعر میں تخلص استعمال کرنے کی بجائے انہوں نے نظم کی ابتدا یا وسط میں زیادہ استعمال کیا ہے۔

علی رضا: علی رضا صوفی شاعر گزرے ہیں۔ آپ ضلع (۱۶۹۵-۱۷۸۰ء) چاٹگام کے موضع اوشن کھائن میں پیدا ہوئے۔ ان کا مقبرہ ان کی قیام گاہ کے پاس ہی ہے۔ آپ ''کانو فقیر'' کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی اولاد اب بھی اس گاؤں میں موجود ہے۔ ان ہی کی زبانی پتہ چلا ہے کہ آپ نے ۱۷۸۰ء میں جبکہ آپ کی عمر نوے سال کی ہوگئی تھی وفات پائی۔ آپ کے صاحبزادے کا نام شرافت اللہ تھا جو ۱۸۴۰ء تک حیات رہے۔ آپ نے تقریباً ۸۰ سال کی عمر پائی۔

تصوف میں علی رضا کے پیر و مرشد پیر قیام الدین تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کی تعداد خاصی تھی۔ اب تک ان کی حسب ذیل تصنیفوں کا پتہ چل سکا ہے: سراج القلوب۔ جنان ساگر۔ اگم۔ دھیان مالا۔ یوگ قلندر۔ سات چکرا بھید۔

ان تصنیفوں کے علاوہ انہوں نے معرفتی گیت اور پداولیاں بھی لکھی ہیں جن میں سے بعض ''راگ مالا'' میں موجود ہیں۔

بنگیہ ساھتیہ پریشد (انجمن بنگلی ادب) نے ''جنان ساگر'' کا ایک ایڈیشن بھی شائع کیا ھے۔ ''اگم'' اور ''جنان ساگر'' مختلف ناموں سے ایک ھی تصنیف کے دو حصے ھیں لیکن پوری تصنیف کا نام معلوم نہ ھو سکا۔

ان کی نظم میں تصوف اور یوگ کی آمیزش ملتی ھے۔ دارا شکوہ نے جس طرح ''مجمع البحرین'' میں ھندو اور مسلم تہذیب کے اشتراک کو دکھانے کی کوشش کی ھے اسی طرح ان کی تصنیف ''جنان ساگر'' میں بھی اس ملاپ پر زور دیا گیا ھے۔

محمد مقیم: اس عہد کے سب سے زیادہ زور بیان رکھنے والے شاعروں میں محمد مقیم بھی شمار کئے ۱۷۷۳ ع جاتے ھیں۔ آپ علی رضا کے روحانی پیرو بھی رہ چکے ھیں۔ انکے بارے میں شاعر علی رضا نے کہا ھے: ''یاد رکھئے میرا دل ان کے لئے محبت سے بھرپور ھے''۔ انہوں نے مسلم ادب کے تاریک عہد پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ھے۔ اس کا ثبوت ان کی نظم ''گل بکاؤلی'' ھے جس میں انہوں نے اپنے سابقین اور ہم عصر شاعروں کے ناموں کی ایک فہرست پیش کی ھے۔ یہ طریقہ قدیم اور جدید عہد کے بنگلی ادب میں

شاذ و نادر ھی پایا جاتا ھے - پچھلے ابواب میں ھم نے اسکا حوالہ بھی دیا ھے - ''فیض المقتدی'' میں انہوں نے بتایا ھے کہ ضلع چاٹگام کا موضع نو اپاڑہ انکی جائے پیدائش ھے - جدید بنگالی ادب کے مشہور و معروف شاعر نوبن چندر سین کی جائے پیدائش بھی یہی ھے -

'' گل بکاؤلی '' میں انہوں نے اپنی جو سوانح عمری لکھی ھے اس سے پتہ چلتا ھے کہ ان کے آبا و اجداد '' فینی '' نوا کھالی کے باشندے تھے مگر سیاسی وجوہ کی بنا پر وھاں سے کوچ کرگئے - چند سال فتح آباد میں ان کا قیام رھا اور وھیں کارو بار کرتے رھے - اسکے بعد وہ عظیم پور آئے اور آخرکار پھر نواپاڑا میں سکونت اختیار کرلی - ان دنوں عظیم پور فتح چاری تھانہ کے ماتحت ھے - انکے آبا و اجداد میں ایک صاحب جو '' بڑا سادہ '' کے نام سے مشہور ھیں اس گاؤں میں رھتے تھے - '' بڑا سادہ '' کے سب سے بڑے لڑکے کا نام محمد افضل تھا - ان کے لڑکے سید محمد دوست تھے اور سید محمد دوست کے صاحبزادے محمد مقیم ھیں - بچپن ھی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا - قسیم الدین چودھری نامی ایک مقامی شخص کے

لڑکے جیون حسین چودھری نے انکی تعلیم کے اخراجات برداشت کئے - نوجوانی میں محمد مقیم زمیندار علی اکبر صاحب کی کچہری میں کلرک ہوگئے تھے اور اس طرح انکے گھر کا گزارہ ہو جاتا تھا - شاہ غازی شریف (چاٹگام) کے خاندان کے شاہ شہاب الدین ان دنوں دیا گنج آئے تھے جنکے بارے میں شاعر نے اپنی نظم "گل بکاؤلی" میں اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے -

کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فارسی کا ترجمہ ہے - "گل بکاؤلی" انکی وہ پہلی تصنیف ہے جو نوجوانی کے آخری دنوں یا عمر کے وسطی حصہ میں لکھی گئی - اگرچہ یہ فارسی کا ترجمہ ہے مگر اس میں بہت سے طبعزاد ٹکڑے بھی ملتے ہیں - اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو ہند و علم جوتش، ہندو اور مسلم مذاہب اور علم عروض میں اچھا خاصا درک حاصل تھا - علم موسیقی میں بھی آپ کو دخل تھا - اس لحاظ سے ان کا مقابلہ علاول کے علاوہ کسی دوسرے شاعر سے نہیں کیا جا سکتا -

اسکی "مناجات" میں ہمیں بالکل ہی دوسری چیز ملتی ہے -

بلا شبہ انہوں نے خدائے بر تر کے انعام و اکرام بیان کئے ، حضرت صلعم کی نعت لکھی ہے اور صحابہ کی تعریف کی ہے ، لیکن ساتھ ہی مناجات میں انہوں نے اپنے آبا و اجداد ، چار پیر ، بارہ اماموں اور چودہ صوفیوں کے قصیدے بھی لکھے ہیں ۔ اسکے بعد شاعر نے ہفت افلاک' سات سمندر ، زمین کے سات طبقات اور سلسلہ ہائے کوہ اور سات اقلیموں کا بھی حوالہ دیا ہے ۔ یہاں تک کہ اس سلسلے میں انہوں نے تخت دہلی کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے ۔ ان کی کتاب " گل بکاؤلی " کی صحیح تاریخ تصنیف معلوم نہیں ہے ۔ لیکن ہم ان الفاظ سے کسی نتیجے پر ضرور پہنچ سکتے ہیں کہ : " انگریز بادشاہ کا تعلق فرنگی قوم سے ہے " ۔ بردوان ، مدنا پور اور چاٹگام کے اضلاع پر انگریزوں کا قبضہ ۱۷۶۰ء میں ہوا تھا ۔ غالباً "گل بکاؤلی" بھی اسی منتقلی اقتدار کے فوراً بعد مکمل ہوئی ہوگی ۔ شاعر نے تین اور نظمیں بھی لکھی ہیں ۔ غالباً انکی آخری تصنیف " فیض المقتدی " ہے ۔ اس تصنیف کے دیباچے میں شاعر نے اپنی تین اور تصنیفوں کا بھی حوالہ دیا ہے جنکے نام یہ ہیں : " کلا کام " " مر بکاوتی " اور "ایوب نبیر کتھا" (پیغمبر ایوب کا قصہ) ۔ انہوں نے ان تصنیفوں

کے بارے میں واضح لفظوں میں کہا ہے کہ یہ تینوں مذہبی تصنیفیں ہیں جو ان کے پیر و مرشد علی رضا کے ایما پر لکھی گئی ہیں۔

یہ کوئی بیانیہ نظم نہیں مذہبی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں تاریخوں کا جو گوشوارہ شامل کیا گیا ہے اس سے اس کی تاریخ تصنیف ۱۷۷۳ء ظاہر ہوتی ہے یعنی جنگ پلاسی کے سولہ سال بعد مقیم نے ''فیض المقتدی'' لکھی تھی۔ غالباً یہ ان کے بڑھاپے کی تصنیف ہے۔

محمد علی : خود نوشت سوانح سے پتہ چلتا ہے (۱۷۷۳ء میں حیات تھے) کہ آپ موضع عادل پور، عظیم نگر (چٹاگام) کے رہنے والے تھے۔ اور شاعر مقیم کے ہم عصر تھے۔

انہوں نے اپنی تصنیف ''حیرت الفقہ'' کے دیباچے میں چاٹگام کی جو تعریف لکھی ہے اس میں شاعر مقیم کو اپنے زمانے کا ''فاضل ترین'' شخص کہا ہے۔ یہ نظم لیالنگ کے زمیندار یوسف حنیف کی تجویز پر لکھی گئی تھی۔ ان کی تالیف فقہ سے تعلق رکھتی ہے اور دراصل ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں قوانین شریعت پر

واقعی عجیب و غریب سوالات کئے گئے ہیں اوران کے جوابات بھی دینے کی کوشش کی گئی ہے ۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے :—

" میں ایک ایسے ظالم شخص کی کہانی بیان کرتا ہوں
جس نے ایک مسلمان کو قید میں رکھا اور
کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں دیا ۔
بلکہ اس سے بڑھکر اس ظالم نے اسے سئور کا گوشت
پیش کیا اور کھانے کا حکم صادر کیا
اب آپ بتائیے کہ اس مسلمان کو سئور کا گوشت
کھانا چاھئے یا نہیں؟
وہ کب تک کھائے پئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے ؟
اگر انکار کرتا ہے تونتیجہ خودکشی ہے جو کسی
حال میں روا نہیں۔"

انہوں نے دو بیانیہ نظمیں بھی لکھی ہیں جن کے نام ہیں:
"شاہ پری" "ملک زادہ" اور "حسن بانو"
ہم ان میں سے چند کے حوالے پہلے دے چکے ہیں ۔
'حسن بانو' کے مسودے کے صرف دو ورق کا پتہ چل

سکا ھے ، جن میں دکھایا گیا ھے کہ شام کا شہزادہ حسن بانو کی تصویر دیکھکر اس حد تک فریفتہ ھوا کہ اس کی تلاش میں نکل پڑا - اس نظم میں فارسی بحر کی نقل کی گئی ھے اور ایک صاحب یار علی کی سرپرستی میں لکھی گئی تھی -

محمد قاسم: رسالہ "ماہ نو" (بنگالی) کے کسی حالیہ (۱۹۶۰ء) شمارے میں ان پر ایک مضمون شائع ھوا تھا اور اسی مضمون میں ان کی ایک نظم بھی نقل کی گئی تھی - مرحوم عبدالکریم ساھتیہ وشارد نے بھی اپنی تصنیف "بنگلہ پراچین پوتھی ووارن" میں ان کا ذکر کیا ھے - اب تک ان کی صرف تین تصنیفوں کا پتہ چل سکا ھے جن کے نام یہ ھیں: (الف) "ھت اپدیش" (ب) سلطان جمجمہ (نامہ) (ج) سراج القلوب (۱۷۹۰ء) -

شاعر نے 'سراج القلوب' میں جو طویل خود نوشت سوانح حیات لکھے ھیں اس سے پتہ چلتا ھے کہ ان کے والد کا نام شاہ عزیز تھا اور آپ نوا کھالی کی راجدھانی "جو گیدیا" میں پیدا ھوئے تھے - اب تو اس سلطنت کا نام و نشان

بھی نہیں ہے۔ البتہ اس نام کا چھوٹا سا گاؤں بیشک ابھی موجود ہے - ''سراج القلوب'' ۱۷۹۰ء میں لکھی گئی۔ اس تصنیف سے شاعر کا مقصد ان بنگالی مسلمانوں کے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کرنا تھا جو عربی زبان سے ناواقف تھے - یہ کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے ، جن میں یہ مضامین شامل ھیں: ذکر بسم اللہ ، سورہ ٔ فاتحہ ، نماز ، روزہ ، حدیث ، قبر میں فرشتوں کا آنا ، والدین کے حقوق ، قرآن کے اقوال دانش ، قیامت ، بہشت وغیرہ -

''ھت آپدیش'' - انکی تصنیف سنسکرت کی اسی نام کی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ یہ تصوف کی ایک کتاب ہے - یہ شاید عربی کی کتاب ''برھان العارفین'' کا آزاد ترجمہ ہے - سلطان یمامہ کا قصہ کون مسلمان نہیں جانتا جس میں حیات بعد الموت کا حال ہے جو سلطان یمامہ نے اسوقت بیان کیا جب انہیں حضرت عیسیٰ کی بدولت دوبارہ زندگی ملی - اس قصہ سے یہ سبق حاصل ھوتا ہے کہ انسان کو دنیاوی اعمال کی مناسبت سے جزا ملتی ہے -

محمد قاسم دراصل مذھبی شاعر ہے اور اس کا ادبی اسلوب بہت قابل قدر ہے - انکی تصانیف کی غرض وغایت

عامۃ الناس کی اخلاقی اصلاح ہے اور ان سے یہ غایت بدرجہ اتم پوری ہوتی ہے۔

(٦) **سید نورالدین:** سید نور الدین مذہبی شاعروں میں سب سے ممتاز ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چاٹگام کے باشندے تھے ان کی تصانیف بلحاظ معنی و اسلوب اپنے عربی و فارسی ماخذوں سے بہت زیادہ قریب اور انکی علمی سطح بھی تمام ماقبل الذکر کتابوں سے بلند تر ہے۔ ان کی نظموں کی نقلیں عربی اور بنگلہ دونوں طرح کے رسم الخط میں متعدد مقامات پر محفوظ ہیں۔ عربی کا قدیم ترین نسخہ ۱۸۳۰ء کا ہے۔ بنگلہ کے مخطوطے اس سے قبل کے ہیں۔ ہم شاعر کی حسب ذیل کتابوں کا سراغ لگا سکے ہیں۔ (الف) حقائق، یا دقائق الحقائق (ب) موسار سوال (موسیٰ کے سوال) (ج) راحت القلوب یا قیامت نامہ (د) ہت اپدیش یا برہان العارفین۔

دقائق کا خلاصہ ۲۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ فقہ عربی کی ایک کتاب کنزالدقائق مصنفہ امام حفیظ الدین ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی (متوفی ۷۱۰ ہجری مطابق ۱۳۱۰) کا ترجمہ ہے۔ اصل کتاب پر متعدد حاشیے ہیں۔ نہیں معلوم کہ شاعر نے سب دیکھے تھے یا نہیں۔ کتاب میں لکھا گیا ہے

که سید نورالدین ابن عزیز نے ۱۲۷۹ بنگله مطابق ۱۷۹۰ء میں اس کو نظم کیا -

''موسارسوال'' بہت مختصر ھے- یعنی صرف ۱۲ صفحات پر مشتمل ھے - یہ بھی ان کی اصل تصنیف نہیں ھے بلکہ کسی فارسی یا عربی رسالہ کا ترجمہ ھے مگر لفظی ترجمہ نہیں ھے- چنانچہ شاعر کہتا ھے : '' نورالدین نے یہ سوال جواب ایک کتاب میں پڑھے اور اس رسالہ کو نظم کیا- اسکے خیالات خالص مذھبی تھے- یہ گفتگو حضرت موسیٰ اور اللہ تعالیٰ میں ھوئی''- خداتعالیٰ اور حضرت موسیٰ میں یہ گفتگو ادبی دلچسپی کی چیز ھے-

''راحت القوب'' : یہ بہت ضخیم کتاب ھے- اور اسی نام کی فارسی کتاب اس کی بنیاد ھے- اس میں ۱۹ باب ھیں جن میں حیات اور موت' حقوق والدین- جنت دوزخ- سود - جھوٹ- غیبت - حسد' تقویٰ کے عام اصول' غرض وہ سب باتیں درج ھیں جو ایک سچے مسلمان کے لئے مفید ھوسکتی ھیں -

ان کی ایک اور کتاب ''ھت آپدیش'' تصوف کے اسرار پر ھے- عالم کے علاوہ یہ ایک زبردست صوفی بھی تھے مگر ھمیشہ شریعت ظاھری کے بھی پابند رھے- انکی کتاب سے یہ نہیں معلوم ھوتا کہ وہ کسی کے مرید تھے یا نہیں - خود شاعر کے بقول ؎

کتاب ۱۲۰۲ بنگلہ سال مطابق ۱۷۹۶ء میں نظم ہوئی -

سید حمزہ: سید حمزہ کا اصل وطن ارنا یا اورونا (۱۸۰۶ — ۱۷۳۲) تھا جو ضلع ھگلی کی سرحد پر بھرشت پرگنہ کا ایک موضع ھے - انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ۱۷۳۲ اور ۱۸۰۶ کے درمیان لکھا ھے سنہ ۱۷۹۲ء میں دریائے دمودر میں سیلاب آیا تو یہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور رانا تھانہ ضلع رائدہ پرگنہ میں آکر مقیم ھوئے - ان کے دادا کا نام سید عبدالقادر اور والد کا نام سید ھدایت اللہ تھا - ان کے دو بیٹے تھے' حکیم الدین اور قطب الدین - ھمیں ان کی زندگی کے صرف اتنے ھی حالات کا علم ھے -

ان کی صرف پانچ ھی چیزیں دستیاب ھوسکی ھیں جن میں سے چار کا ذکر ان کی کتاب ''حاتم طائی'' میں ھے - مدھو مالتی - امیر حمزہ - جیگن پنتھی - اور حاتم طائی - ان کی ترتیب تصنیف بھی یہی ھے - سونا بھان ان کی پانچویں اور آخری تصنیف ھے -

''مدھومالتی'' غالباً سنہ ۱۷۹۰ء میں لکھی گئی - اس کتاب کی بابت بعض دلچسپ باتیں ھیں - یہ زیریں بنگال کی زبان دو

بھاشی بنگالی میں نہیں بلکہ اس وقت کی معیاری بنگالی میں لکھی گئی ہے۔ ان کی دیگر تصانیف کی بہ نسبت بیان و زبان کے لحاظ سے بھی اعلیٰ ہے، اور صاف فطری انداز میں لکھی گئی ہے ۔ اسے مسلمانوں کی زندگی یا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ یہ خالص ادبی چیز ہے اور اسکا مقصد صرف شعری مسرت عطا کرنا ہے ۔ اس کی زبان سے ثابت ہوتا ہے کہ سید حمزہ کے عہد یعنی ۱۸۰۰ء تک زیریں بنگال کے مسلمان اپنی ادبی تصانیف میں معیاری بنگالی استعمال کرتے تھے ۔ ہاں جب مسلمانوں کی زندگی یا مذہبی موضوع پر کچھ لکھتے تو دوبھاشی بنگالی میں لکھتے تھے ۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دوبھاشی بنگالی معیاری بنگالی کی بہ نسبت ادبی حیثیت سے کم تر تھی ۔

"امیر حمزہ" اس نام کی ایک مختصر نظم کی تفصیل ہے جو ان سے قبل غریب اللہ نام ایک شاعر نے لکھی تھی ۔ سید حمزہ نے اعتراف کیا ہے کہ "استاد الشعرا" غریب اللہ مجھ سے برتر ہیں مگر اصل نظم سے ان پڑھنے والوں کی تسکین نہیں ہوتی جو تفصیلی بیان کے خواہشمند ہیں ۔ اس حصہ سے میں نے حضرت امیر حمزہ کے لاتعداد کارناموں کو

تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ نظم تمام تر "پایار" میں لکھی گئی ہے لیکن آخر کا کچھ حصہ "تری پدی" میں نظم ہوا ہے ۔ سن تحریر ۱۲۰۱ بنگالی درج ہے ۔

"جے گنر پنتھی" : ۱۲۰۴ء بنگلی یا ۱۷۹۷ء میں لکھی گئی ۔ اس میں جے کن اور محمد حنیفہ کی جنگ دکھائی گئی ہے جسکا خاتمہ محمد حنیفہ کی فتح پر ہوا ۔

"حاتم طائی" ان کی چوتھی تصنیف عزت اللہ نامی ایک صاحب کی فرمائش پر شروع کی گئی مگر جلد ھی عزت اللہ نے اسکی سرپرستی سے ھاتھ اٹھالیا اور شاعر نے اسے کچھ دنوں کے لئے نا تمام ھی چھوڑدیا ۔ کچھ عرصہ کے بعد نورنت کے رہنے والے شیخ چاند مولا کے فرزند شیخ حکیم اللہ کی فرمائش پر پھر اسے شروع کیا ۔ شاعر نے "چھٹے سوال" پر نظم چھوڑدی تھی مگر اب اس نے مزید دو باب لکھ کر اسکو ختم کیا ۔ جیسا کہ شاعر نے کتاب معنون کرتے ہوئے لکھا ہے' شیخ چاند مولا اور ان کے صاحبزادے لکھنا یا پڑھنا نہیں جانتے تھے مگر نظم سننے کا بہت شوق تھا ۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے اور اسلوب بیان بہت پر تکلف ہے ۔ اس نظم میں شاعر نے حاتم کے کارناموں کو سبق آموز بنادیا ہے ۔

ان کی آخری تصنیف ''سونا بھان،، نسبتاً مختصر نظم ھے اور دوبھاشی زبان میں لکھی گئی ھے -

ان کی تمام تصانیف '' بڑتله '' سے طبع ھوئی ھیں - ان کے نسخے اکثر مسلمانوں کے گھروں میں موجود ھیں - کچھ دن پہلے تک بنگالی مسلمانوں کا عام طبقه ان کتابوں کو بہت ذوق و شوق سے پڑھتا تھا -

چوھر: یه ۱۸۰۴ء سے ۱۸۳۵ء تک حیات تھے- (۱۷۷۰ء تا ۱۸۴۰ء) ان کے خود نوشت حالات سے ھمیں معلوم ھوتا ھے که ان کے جداعلیٰ ''عظمت،، گوڑ سے بانس کھالی (چٹگاؤں) میں آکر بسے تھے - ''راجه ماگھ،، '' عظمت ،، کے بیٹے ''کمال مردھا ،، کی بہت قدر کرتا تھا - خود ان کے والد کا نام واعظ الدین تھا اور ان کے پیر و مرشد مطیع اللہ تھے - ان کے سر پرست ''دوھاجری،، ''جعفر علی'' تھے- چٹگاؤں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے وکیل تھے - اور جیسا که شاعر کہتا ھے که کلکته کی ٹکسال میں بھی کام کرتے تھے - شاعر سے ان کی ملاقات چٹگاؤں میں ھوئی اور وھیں انھوں نے اس سے نظم لکھنے کی فرمائش کی - شاعر کے خود نوشت حالات سے ھمیں اس کا زمانه متعین کرنے

میں مدد ملتی ہے ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ٹکسال ۱۸۰۲ء
میں قائم ہوئی اور اسکے سکوں پر ولیم چہارم کا ٹھپہ جون
۱۸۳۵ء میں لگا ۔ اسطرح ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ان
تاریخوں کے درمیان حیات تھا ۔

اب تک ہم نے ان کی چار تصانیف کی بابت سنا ہے
مگر مسودہ صرف ایک ہی تصنیف کا دستیاب ہوا ہے ۔ اسکا
نام " آذر شاہ و شمع رخ " ہے ۔ شاعر نے اپنی دو عشقیہ نظمیں،
'منوہر مدھو مالتی' اور 'دل آرام' اپنے پیر مطیع اللہ کی فرمائش
سے لکھی ہیں " آذر شاہ و شمع رخ " اور " سجن جیراوتی " بھی
عشقیہ نظمیں ہیں مگر یہ دونوں جعفر علی کی درخواست پر
لکھی گئی ہیں ۔

" آذر شاہ و شمع رخ " کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے اس
کا آخری حصہ پھٹا ہوا ہے ۔ بہرکیف اس کا قصہ حسب ذیل ہے :

کسی ملک کا بادشاہ آذر شاہ بے اولاد تھا ۔ اس سے متعدد
مقامات کے علماء و فقرا نے کہا کہ ملکہ 'سونالا' سے اس کے
کوئی اولاد نہ ہوگی اور اگر " شاہ مشرق " کی بیٹی شمع رخ
سے اس نے شادی نہ کی تو وہ بے اولاد مرجائے گا ۔ جہاندیدہ
و غدر رسیدہ وزیر کی کوششوں سے آخر کار عقد کا سر انجام

ہوا۔ اس بات سے ملکہ 'سونالا' رشک و حسد سے جل بھنی اور
آذر شاہ کو کچھ ایسی دوا کھلا دی کہ اسکی قوت مردمی
زائل ہو گئی ۔ بہر حال ایک اور دوا سے اسکی قوت پھر عود
کر آئی اور شمع رخ امید سے ہو گئی ۔ راجہ پھر کسی بری بیماری
میں پھنس گیا ۔ یہ کوئی سحر تھا اور عمر رسیدہ وزیر اس طلسم کے
توڑ کی تلاش میں نکلا اور دیس دیس پھرتا پھرا ۔ سفر کے
دوران میں اس کو عجیب و غریب واقعات پیش آئے ۔ آخر کار
وہ بغداد پہنچا تا کہ وہاں "صفاہاں" نامی ایک
خدا رسیدہ بزرگ کی مدد حاصل کرے ۔ وزیر باتدبیر بزرگ
کی خدمت میں پہنچا ۔ مگر اس مقام سے آگے کے اوراق پھٹے
ہوئے ہیں اور قصہ نا تمام رہتا ہے ۔

چوہر نے عام طور پر علاول اور دیگر ماسلف شعرا کا
تتبع کیا ہے ۔ مگر اسکی تصنیف کا علمی مرتبہ بھی بلند ہے
اور قوت نظم بھی قابل تعریف ہے ۔ اسکی تصنیف سے یہ بھی
ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندو مذہب اور ہندو علم ہیئت سے
بھی بہت باخبر تھا ۔

حمید اللہ خان: خان بہادر حمید اللہ خان سے چاٹگام
(۱۸۰۸—۱۸۷۰) کے رہنے والے خوب واقف ہیں کیونکہ
انہوں نے "لامار بازار" نامی مارکٹ قائم کی تھی جو "بخشی

کی ھاٹ" سے بہت فاصلے پر واقع ھے۔ وہ بنگالی زبان کی مہارت رکھنے کے علاوہ عربی اور فارسی بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ جہاں تک ھم کو علم ھے یہ ۱۸۰۸ء سے ۱۸۷۰ء تک زندہ رھے۔ ۱۸۵۷ء کے ھنگامے کے وقت ان کی عمر پچاس سال تھی۔ کمپنی کی بہت مدد کی۔ انہی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے ان کو خان بہادر کا خطاب دیا۔

جیسا کہ ھم پہلے کہہ چکے ھیں حمیداللہ ان شعراء میں سب کے بعد کے ھیں جنھوں نے بنگالی میں عہد مغلیہ کی روایات کو زندہ رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ انکے بعد بھی بعض شعراء ایسے گزرے ھیں جنہوں نے جدید اثرات قبول کئے مگر ان کی فارسی کی قابلیت کچھ زیادہ نہ تھی اور وہ عہد مغلیہ کی روایات کو صرف سطحی طور پر ھی اپنا سکے۔ حمید اللہ خاں صاحب سے اہل تاریخ بھی اچھی طرح واقف ھیں۔ کیونکہ وہ 'تواریخ حمیدیہ' کے مصنف ھیں۔ یہ کتاب اگرچہ چٹگام کی سن وار تاریخ نہیں ھے مگر بندرگاہ چٹگام کے متعلق واقعات سے مملو ھے۔

پھر بھی بہت کم لوگ اس امر سے واقف ھیں کہ انہوں نے فارسی کے گلستان سے پرواز کرکے بنگالی ادب کے

''کنول نگر'' میں بھی اپنے گیت گائے ہیں۔ انکی بنگالی تحریریں کم ہیں مگر جاذب توجہ ہیں۔ ہمارے پاس ان کی صرف دو نظمیں ہیں: 'ترن پاتھ' اور 'شہادت ادیان' یا 'گلزار شہادت'۔ انکی ایک کتاب نثر میں بھی ہے جسکا ذکر ''بنگلہ پراچین پوتھیر وِوارن'' میں کیا گیا ہے مگر ہم نے اسکا تفصیلی ذکر کہیں نہیں دیکھا۔

'گلزار شہادت' واقعات کربلا کے متعلق نظم ہے۔ اس کے طویل دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ نظم اسوقت لکھی گئی جب شاعر سال قمری کے حساب سے پچپن سال کا ہوچکا تھا۔ کہن سالی میں یہ بہت افسردہ و غمگین معلوم ہوتے ہیں۔ مادہ تاریخ ''رمضان فقط'' سے صحیح تاریخ اختتام کتاب بحساب ابجد ۱۲۸۰ء نکلتی ہے۔ اسطرح انہوں نے یہ کتاب ۱۸۶۳ء میں ختم کی جب انکی عمر ۵۵ برس کی تھی۔ اسلئے ان کی سنہ پیدائش ۱۸۰۸ء دریافت ہوتا ہے۔

انکی 'راہ نجات' یا 'ترنپاتھ' ۱۸۶۸ء میں نظم ہوئی۔ یہ دراصل سچے مسلمانوں کے لئے مذہبی ہدایات کا مجموعہ ہے۔ داڑھی منڈانے کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ ۱۸۶۵ یا ۱۸۶۶ء میں انہوں نے غالباً اور

تظمیں بھی لکھیں مگر ان موضوعات اور ان عنوانات کا ہمیں علم
نہیں ۔ حمید اللہ کی تصانیف عہد مغلیہ اور بنگالی شاعری کے
جدید اسکول کے عبوری دور کی چیز ہیں۔

باب سوم

بنگالی ادب کے نئے رجحانات

(۱۸۵۷—۱۹۴۷)

نئی راہ

موجودہ زمانے کا مسلم بنگالی ادب ان مغربی اثرات کی پیداوار ہے جو انگریزی تعلیم کے پھیلنے سے ہماری ثقافتی زندگی پر پڑے۔

ہم یہ پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان کس طرح مذہبی، معاشی اور سیاسی وجوہ سے عرصے تک انگریزی تعلیم کی طرف سے سرد مہری کا رویہ اختیار کئے رہے۔ مگر انگریزی تعلیم فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد سے پھیلتی ہی چلی گئی۔ انیسویں صدی کے آخر میں کہیں جاکر وہ انگریزی کی تحصیل کی جانب مائل ہوئے۔ اس طرح بنگال کے مسلمان ترقی کی دوڑ میں ہندوؤں سے ۱۵۰ سال پیچھے رہ گئے۔ اسکی وجہ سے مسلم بنگالی ادب کو بھی سخت نقصان پہنچا۔ جسکی

تلافی بڑی مشکل ہوسکی۔

فورٹ ولیم کالج نے ادبی نثر کا جو نیا اسلوب شروع کیا تھا اسکی طرف مسلمانوں کی توجہ ۱۸۵۷ع تک نہیں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ ادبی نثر کا رواج اس عہد کی مفید ترین ترقی تھی جسکی وجہ سے بکثرت ناول، ڈرامے مضامین، مختصر افسانے، جدید سوانح عمریاں، رسائل، نیز سائنسی مضامین لکھی گئیں۔ روایتی طریقہ، شاعری نے بھی مغرب سے نئے اسالیب حاصل کئے، نئی روایات کو جذب کیا اور اپنی وضع و ہئیت، بلکہ روح میں بھی تبدیلی پیدا کرلی، ادھر جب راجہ رام موہن رائے، ایشور چند ودیا ساگر، اکشے کمار دت، بہاری لال چکر ورتی، مدھو سودن دت، بنکم چندر چٹوپادھیہ جیسے مصنفوں کی کوششوں سے جدید بنگالی نثرکی روایات اچھی طرح قائم ہوچکی تھیں اور بنگالی شاعری نئے میلانات کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر کافی آگے بڑھ چکی تھی اسوقت بھی مسلمانوں کی انگریزی تعلیم سے نفرت برابر قائم تھی اور وہ نئی ادبی تحریکات سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ اسی وجہ سے اس دور کے بنگالی ادب پر مسلمانوں کے خصوصی اثرات نظر نہیں آتے اور وہ واقعی روح اور ہئیت کے لحاظ سے سراسر

ہندوانہ ہے۔ جب مسلمانوں نے اس میں کوئی قابل لحاظ کام نہیں کیا تو ایسے ادب میں مسلمانوں کے اثرات کی تلاش بھی لاحاصل ہے۔ اس کی تخلیق میں انہوں نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔

مسلم الاصل فرسودہ کہانیاں مثلاً ''طوطا کہانی'' اور گل بکاؤلی جنکو بعض ہندو مصنفین نے فورٹ ولیم کالج سے شائع کیا تھا اس جاندار بنگلی ادب کے مقابلہ میں بالکل ہیچ تھیں جو مغربی رجحانات سے متاثر تھا۔ اس کے باوجود چند روایتی موضوعات جو جدید طرز میں پیش کئے گئے تھے کافی پسند کئے گئے مثلاً میر مشرف حسین کی ''وشاد سندھو'' (۱۸۸۵) ہندوؤں، مسلمانوں میں یکساں مقبول ہوئی۔ مسلمان مصنفین نے ایسی ہی اور کوششیں کی ہوتیں تو مسلمانوں کی روایات زندہ اور ترقی پذیر رہتیں اور وہ تعلیم میں پیچھے نہ ہوتے تو بنگلی ادب میں ان کا حصہ بھی اتنا ہی گرانقدر ہوتا جتنا کہ ہندوؤں کا ہے اور نذرالاسلام کی طرح کچھ اور بھی زبردست ادبی ہستیاں پیدا ہوتیں۔

بنگلی نثر و نظم میں ۱۸۰۰ء سے جو انقلابی رجحانات شروع ہوئے تھے وہ ۱۸۵۷ء میں اچھی طرح واضح ہو گئے تھے اور چونکہ نیا ادب زیادہ تر ہندوؤں کا تخلیق کردہ تھا اسلئے

اس میں لامحالہ ان کے اصل قومی اثرات داخل ہوگئے اور وہ ہندو روایات، ہندو فلسفہ اور ہندو صنمیات سے بھرا ہوا ہے۔ مگر روایتی ہندو مذاق مسلمان دماغوں میں ذرہ برابر بھی نہیں سما سکا۔ بنگالی زبان میں سنسکرت الفاظ کی بہتات کو ہندو اثر نہیں کہا جاسکتا۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ادبی زبان سنسکرت آمیز بنگالی تھی جو بعد میں معیاری بنگالی کہلائی۔ مسلم بنگالی یا ''دو بھاشی بنگلہ،، بنیادی طور پر ویسی ہی زبان ہے جیسی کہ معیاری بنگالی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں دو بھاشی بنگلہ کی تحریک جس کی غایت یہ تھی کہ بنگالی سے سنسکرت الفاظ نکال دئے جائیں اور بنگالی کو اردو سے قریب تر کردیا جائے کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ اسی طرح فارسی آمیز بنگالی جو فورٹ ولیم کالج کے عملہ نے اپنی ابتدائی تصانیف مثلاً ''پرتا پادیا چرت'' ''گل بکاؤلی،، اور ،، طوطا کہانی'' میں استعمال کی تھی وہ بھی رائج نہیں ہوسکی۔

۱۸۵۷ع کے ہنگامے کے بعد بھی جبکہ انگریزی تعلیم کی طرف سے مسلمانوں کی نفرت کچھ کم ہوگئی تھی اور نئے اثرات نے ان کے دماغوں کے دروازے کھول دئے تھے، مسلمانوں کی

اقتصادی پسماندگی کے باعث انکی رفتار بہت سست رہی - طبقۂ عوام ''بڑتلہ،، کی بنائی ہوئی پونتھیاں سننے پر قناعت کئے رہا مگر مسلمانوں کے طبقۂ اعلیٰ میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ ان کی زبان اردو ہو یا بنگالی - یوں تو اردو کو اختیار کرنے کی تحریک کچھ عرصہ تک چلتی رہی مگر اسے ابتدا ہی سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا -

بہر حال، مسلمانوں کے طبقۂ متوسط نے ماحول کا اندازہ لگا کے بنیادی حقیقتوں پر غور کیا اور بتدریج انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی، کیونکہ اس کے بغیر ان کو نہ تو سرکاری نوکری ملتی تھی نہ وہ تجارتی کمپنیوں ہی میں ملازم ہوسکتے تھے - معماری [illegible] ان کی بساط سے باہر تھی ان کی راہ میں بھی ایک بڑی رکاوٹ تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ ادبی سرگرمی کے نئے حالات سازگار رہے - اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ جو متعدد زبردست اہل قلم پیدا ہوئے وہ سب کے سب طبقۂ متوسط کے افراد تھے ان میں میر مشرف حسین (۱۸۴۸—۱۹۱۱) کیقباد (۱۸۸۰— ۱۹۵۱) داد علی (۱۸۵۶—۱۹۰۳) شیخ عبدالکریم (۱۸۵۹— ۱۹۳۱) محمد مزمل حق (۱۸۶۲—۱۹۰۲) منشی مہراللہ - پنڈت ریاض الدین - عبدالکریم ساہیتہ وشارد (۱۸۶۹—۱۹۵۳ ا

مولانا منیرالزماں اسلام آبادی (۱۸۵۷–۱۹۵۰) مسلم بنگالی ادب کی ممتاز ہستیاں ہیں -

نئے راہ داں

میر مشرف حسین: دور جدید کے بہترین فنکاروں میں (۱۸۴۸-۱۹۱۱): ہیں - آپ بنکم چندر (۱۸۹۴- ۱۸۳۸) کے ہم عصر تھے - پیدائش موضع ساھینی پدا میں ہوئی - جو اسوقت کشتیا ضلع میں ہے اور اسوقت ضلع ندیا کی سب ڈویژن کستیا میں واقع تھا - یہ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرسکے مگر ان کی ادبی فطانت شروع ہی میں بارآور ہوئی اور جب ان کا پہلا ناول ''رتناوتی'' ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا تو ان کی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی - انکی آخری تصنیف 'امر جیونی' بارہ جلدوں میں ہے جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک مسلسل شائع ہوتی رہی - 'رتناوتی' اور 'بی بی کلثوم' کے درمیان تقریبا ۳۰ دیگر تصانیف ہیں جن میں ناول ' ڈرامہ (بشمول کامیڈی) ' نظمیں ' غنائی ڈرامہ ' مضامین اور معاشرتی خاکے شامل ہیں - ان کی تصانیف میں حسب ذیل فن پارے ملتے ہیں:

رتناوتی (۱۸۶۹ ناول) — گوری سیتو (۱۸۷۳ نظم)
وسنت کماری (۱۸۷۳ ڈرامہ) زمیندار درپن (۱۸۷۳ ڈرامہ)

وشادسندھو (۱۸۹۱ - ۱۸۸۵ - محرم کے متعلق ایک تاریخی ناول '
سنگیت لہری (۱۸۸۸ - گیت) گو جیون (مضامین) '
بھولا گیتا بھنائے (۱۸۸۹ غنائی ڈرامہ) او داسین پتھیکر
مونیر کتھا (ناول) گاجی میار وستنی (۱۹۰۰-۱۸۹۸ معاشرتی خاکہ)
میلاد شریف (۱۹۰۲ء نظم و نثر - مذہبی تصنیف)
مسلمان بنگلہ شیکھا (۱۹۰۸ — ۱۹۰۳ تعلیمی) امر جیونی
(۱۰ - ۱۹۰۸ : خود نوشت سوانح عمری) بی بی کلثوم
(۱۹۱۰ - سوانح عمری) بی بی خدیجہ وواہ : منظوم سوانح
حیات) حضرت عمریر دھرم جیون لابھ (۱۹۰۵ - منظوم
سوانح عمری) حضرت امیر حمزہ دھرم جیون (۱۹۰۵ -
منظوم سوانح عمری) مدینار گوراب (۱۹۰۵ - نعتیہ نظم) مسلم
ویراتا (۱۹۰۷ - نظم) اسلامیر جوئے (۱۹۰۸ - نظم
بمعنی فتح اسلام) وجے مت (۱۹۰۸ - نظم ' بمعنی فتح دین '

میر مشرف حسین بڑے زبردست ادیب تھے - انکی
کتاب 'وشاد سندھو' (دریائے غم) بڑی گرانقدر تصنیف ہے -
انہوں نے مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں کے جو حالات لکھے
ہیں وہ بہت پرتا ثیر ہیں اور بنگال میں مسلمانوں کو بیدار
کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے -

شاعر کیقباد : ان کا اصل نام محمد قاسم القریشی تھا ۔ (۱۸۵۲ — ۱۹۵۱) عمر میں یہ رابندر ناتھ ٹیگور سے تین سال بڑے تھے اور ان کے بعد بھی عرصہ تک زندہ رہے انکی پیدائش موضع آگلا میں ہوئی جو ڈھاکہ کی ایک سب ڈویژن نواب گنج میں واقع ہے ۔ مگر ان کا آبائی وطن ناریل ضلع فریدپور تھا ۔ شفقت مادری سے پہلے ہی محروم ہوچکے تھے بارہ برس کے ہوئے تو باپ کا سایۂ عاطفت بھی سر سے اٹھ گیا ۔ ماموں نے پرورش و برداخت کا بار اٹھایا اور چونکہ ان کا قیام ڈھاکہ میں رہتا تھا اس لئے یہ بھی وہیں آرہے ۔ یہ ابھی انٹرنس کا امتحان بھی دینے نہیں پائے تھے کہ اسکول چھوڑ کر ڈاک خانہ کے محکمے میں ملازمت اختیار کرنی پڑی ۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں ڈھاکہ کے میڈیکل کالج اسپتال میں انتقال کیا ۔

طالبعلمی کے زمانہ میں ان کی نظموں کے دو مجموعے یعنی ”برھا ولاس“ (ہنت ہجراں) اور ”کسم کرن“ شائع ہوئے ۔ ان کی شاعری نے ایک نوجوان لڑکی کربالا کا دل موہ لیا ۔ ان کی شاعری پر اس عشق کا بہت گہرا اثر پڑا ۔ چنانچہ ”اشرو مالا“ کی متعدد نظمیں اسی لڑکی کے نام معنون ہیں ۔ یوں تو ”اشرو

سالا ان کی نظموں کا تیسرا مجموعہ تھا مگر یہ پہلا مجموعہ تھا جس نے ان کو شہرت عطا کی - ۱۹۰۴ء (مطابق ۱۸۱۱ بنگالی) سال میں ''مہاشمشان کاویا،، (رزم عظیم) جوان کی بہترین تصنیف ہے سب سے پہلے شائع ہوئی - اس میں احمد شاہ ابدالی کی مرہٹوں پر فتح کا پرشکوہ بیان ہے - رزم نگاری میں ان کا مرتبہ مائیکل، ھیم چندر اور نوین سین کے برابر ہے - انکے دوسرے اور تیسرے رزمئے ''شو مندر'' اور ''محرم شریف،، ۱۹۱۷ء اور ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئے اور ایک غنائیہ مجموعہ ''اسپادھارا،، ۱۹۲۳ء میں طبع ہوا -

ان کی آٹھ تصانیف اور بھی ھیں (۱) پریمر پھول (۲) پریمر رانی - (۳) پریمر تیرتھ - (۴) من دکنی دھارا (۵) انوتپتا مسلمان - (۶) پریم کنج یا 'بڑاھیر' (۷) پریم پریجت (۸) ابھدیشں رتناولی - ان کی شاعری کا جوھر ان کی غنائی خصوصیت ہے - ان کی رزمیہ نظموں میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے مگر ان کی تمام رزمیہ نظمیں اپنے ھم قوموں میں جذبات شجاعت ابھارنے کے لئے لکھی ہوئی معلوم ہوتی ھیں -

شیخ عبدالرحیم: (۱۸۵۹ - ۱۹۳۱): موضع محمد پور ڈاکخانہ بدوریا ۲۴ پرگنہ کی سب ڈویژن بشیرھاٹ

میں پیدا ہوئے۔ ناگر کے ایک زمیندار بابو رادھا مادھو باسو کی فیاضی سے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کی اس کے بعد اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کیا اور نومبر ۱۸۸۹ء میں ''سدھا کر'' نامی ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جس کے بعد ''مہرو سدھا کر'' شائع ہونے لگا - ۱۹۰۴ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کے خلاف مسلمانوں نے جو تحریک چلائی اسکی انھوں نے زبردست حمایت کی۔ اس کی پاداش میں '' مہرو سدھا کار،، بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے ''مسلم ہتیشی،، جاری کیا جو ۱۹۱۴ء تک چلتا رہا۔ ان کی تصانیف میں حسب ذیل تخلیقات بھی شامل ہیں :

جہاد (۱۸۹۰ء) سماج و سنسکار (۱۸۹۰ء) سوربر وجے (۱۸۹۵ء) اسلام نیتی حصہ اول (۱۹۲۵) اسلام نیتی حصہ دوم (۱۹۲۷ء)نماز شکشا (۱۹۱۷ء) حضرت محمد جیون چرت یعنی سیرت محمدی (۱۹۳۱ء) روزہ تتوہ، حقیقت روزہ (۱۹۲۸ء) نماز تتوہ یعنی حقیقت نماز (۱۹۲۶ء) خطبہ (۱۹۲۸ء) یعنی نصائح قرآن و حدیث' ابدینناولی (۱۹۲۶ء)

'' حضرت محمدیر جیون چرت'' و ''دھرم تتوہ،، ان کی مشہور ترین تصنیف اور بنگالی مسلمان کی لکھی ہوئی سیرت کی پہلی کتاب ہے۔

داد علی : آپ ۱۸۵۶ء میں موضع اتی ضلع کشتیا میں
۱۸۵۶-۱۹۲۷ء پیدا ہوئے۔ یہ اعلی تعلیم سے محروم رہے
مگر ان کی شعری فطانت بہت زبردست تھی۔ ان کی شاعری
میں اگرچہ ان کی شاعری کی علمی اور ذہنی سطح بہت بلند
نہیں ہے مگر اس میں جذبات کی دلنشیں گیرائی موجود ہے
ان کا پہلا مجموعہ "بھاگنا پارن" ان نظموں پر مشتمل
ہے جو انھوں نے اپنی بیوی کی وفات کے فوراً بعد لکھی تھیں۔
"شانتی گنج"، محبت اور وفا کے گیتوں کا ایک اور مختصر
مجموعہ ہے جس کی شعریت کا درجہ کافی بلند ہے۔ "عاشق رسول"
نعتیہ نظموں کا مجموعہ ہے اور مسلم گھرانوں میں بڑے ذوق
و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ان کا ایک اور مجموعہ "انتمی مرتیو"
موت کے متعلق نظموں پر مشتمل ہے۔

محمد مزمل حق : یہ شانتی پور ضلع ندیا کے
(۱۸۶۰ – ۱۹۳۳) باشندے تھے۔ مقدر نے انہیں
اعلی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا مگر ان کو بنگالی نیز
انگریزی اور فارسی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔
ان کی تصانیف کثرت سے ہیں جن میں حسب ذیل خاص
طور پر قابل ذکر ہیں :- (الف) جاتیہ سنگیت (نظم)

(ب) حضرت محمد (منظوم سیرت)، (ج) مہارشی منصور (سوانح عمری)، (د) دیش کا ہمینی (کہانی) (سوانح عمری) (ہ) فردوسی چرت (سوانح عمری) (و) شاہنامہ (تنقید) (ز) زہرہ (ناول) (ح) جاتیاہ فوارہ (نظم) (ط) ٹیپو سلطان (تاریخ)۔

"جاتیہ سنکلپا" اور "جاتیہ فوارہ" بہت ولولہ انگیز ہیں اور مسلمانوں کے جذبات ابھارنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی شہرت دراصل انہی دو تصانیف پر مبنی ہے۔ مگر "حضرت محمد" شاید ان کی عظیم تر نظم ہے۔ "فردوسی چرت"، "مہارشی منصور" اور "شاہنامہ" نثر کی عمدہ کتابیں ہیں۔ "ٹیپو سلطان" میں میسور کے بہادر سلطان کی جنگوں کا حال ہے جن سے اعلیٰ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ معیاری بنگالی میں ان کی استادانہ مہارت آج کے ہندو مصنفوں کے لئے بھی باعث رشک ہے۔

عبدالکریم ساھتیہ وشارد : (۱۸۶۹ - ۱۹۵۳)

چٹاگرام ڈانڈی میں جو چٹگاؤں کے تھانہ پتیا کے قریب ہے ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے کچھ پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا اور اس یتیم کی پرورش اس کے دادا اور چچا نے کی۔ اسکول میں ان کا شمار تیز طلبہ میں ہوتا تھا۔ انھوں نے

انٹرنس کا امتحان سنسکرت لیکر پاس کیا ، اس کے بعد کالج میں داخلہ لیا مگر طویل علالت کی وجہ سے ایف۔ اے کے امتحان میں شریک نہیں ہوسکے۔ ملازمت اختیار کی اور ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز کے دفتر میں کلرکی کر کے اپنا پیٹ پالتے رہے۔

نو عمری ہی میں ان کو یہ سوچ سوچ کر افسوس ہوتا تھا کہ مسلمان اپنے روائتی علم و ہنر سے بے بہرہ ہوگئے ہیں۔ وہ اپنے ہم مذہبوں میں علمی روایات پھر قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور انہوں نے اپنی زندگی علمی تحقیقات کیلئے وقف کردی۔ ان کا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عہد وسطیٰ کے بنگالی ادب کے ۲۰۰۰ مخطوطے گوشۂ گمنامی سے نکالے۔ انہوں نے اپنا یہ زبردست تحقیقاتی کام تن تنہا انجام دیا۔ ان مخطوطات میں تقریباً ۱۲ سو مسلمان مصنفوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ سب کے سب انہوں نے ڈھاکہ یونورسٹی کو عطیہ کے طور پر دے دئے ہیں۔ ہندو مصنفوں کے مخطوطات راجشاہی ویرندرا ریسرچ سوسائٹی کے پاس محفوظ ہیں۔ یہ محض کتابیں جمع کرنے والے نہیں تھے بلکہ انہوں نے بڑی جانسوزی اور قابلیت کے ساتھ بڑا مفید تحقیقاتی کام بھی کیا ہے۔ شاید ہی کوئی اور ایسا شخص تھا جو ان قدیم مخطوطات کو اس روانی اور آسانی کے ساتھ پڑھ سکتا جیسے کہ آجکل کی

طبع شدہ کتابیں ہیں ۔ انہوں نے ۱۵۰ سے زیادہ مسلمان مصنفوں کا سراغ لگایا ۔ اور یہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اب ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان اس جہالت کے باوجود جس میں وہ بعد میں مبتلا ہو گئے تھے ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہونے کے سوسال بعد تک بھی ادبی تخلیق کے میدان میں ہندوؤں سے کہیں آگے تھے ۔ ان کی مساعی کے نتائج ۶۰۰ سے زیادہ گراں بہا مضامین ومقالہ جات میں درج ہیں جو اصل ماخذوں کو براہ راست بنیاد بنا کر لکھے گئے ہیں ۔ چٹاگاؤں اور ندیا کی ادبی انجمنوں نے انکے اس گرانقدر کام کو یوں خراج تحسین ادا کیا کہ انہیں ساہیتہ وشارد اور ساہیتہ ساگر کے خطابات دئے ۔ حکومت پاکستان نے بھی انہیں تا حیات ۵۰ روپیہ ماہانہ کی پنشن دے کر انکی خدمات کا اعتراف کیا ۔

انہوں نے بہت سی پرانی کتابوں کو مدون بھی کیا ۔ ان سے قبل کسی بنگالی مسلمان کو یہ شرف بھی نہیں حاصل ہوا تھا ۔ شیخ فضل اللہ کی ” گورکھا وجے “ ، رتی دیو کی ” مریگا لبدھا “ اور علی رضا کی ” جنن ساگر “ انہی کی مدون کی ہوئی ہیں ۔ انکی تصنیف کردہ بنگلہ ” پراچین پنتھیر ووارن “ (دو

جلدوں میں) بنگالی پر تحقیقات کیلئے بے بہا رہنما ہے۔
''بنگیہ مسلم ساھتیہ سمتی،، کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے جو
خطبہ پڑھا تھا وہ بھی بہت اعلیٰ درجہ کا ادبی کارنامہ ہے۔
''اراکان راج شبھے بنگلہ ساھتیہ'' بھی جو انہوں نے ڈاکٹر انعام الحق
کی رفاقت میں مرتب کی انکے علمی بتحر کی یادگار ہے۔ علاول
کی '' پدماوتی'' جسکی تدوین انہوں نے کی ہے اور انکی ''مسلم
پراچین پونتھیر ووارن'' ابھی تک طبع نہیں ہوئیں۔ ''مسلمان
ویشناوکوی '' ۔ (چار جلدوں میں) ۔ جسکی تدوین برج سندر
سنیال نے کی ہے، اس کا مواد بھی ساھتیہ وشارد ھی
نے دیا تھا۔

مولانا منیر الزماں اسلام آبادی : ان کی

(۱۸۷۵—۱۹۵۰)

ولادت
موضع برما تھانہ پتیا ضلع چٹاگاؤں میں ہوئی۔ یہ عربی
فارسی اور اردو کے بڑے ممتاز عالم تھے۔ انگریزی
بھی خاصی جانتے تھے۔ انکے بعض عربی مضامین مصر
کے عربی رسائل وجرائد میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے
تحریک آزادی میں بڑا کام کیا اور زندگی بھر سرگرم معاشرتی
کارکن رہے۔ ''دی اسلام آباد ٹاون بنک'' اور چٹاگاؤں کا یتیم
خانہ انکی دیرپا یادگاریں ہیں۔

اسلام‌آبادی صاحب ایک زبردست اخبار نویس اور مشہور مقرر بھی تھے۔ "الاسلام اور روز نامہ سلطان"، میں انکی تحریروں نے ھی مولانا اکرم خان کو ان کا گرویدہ کر لیا تھا۔

یہ بڑے پر جوش معاشرتی وسیاسی کارکن تھے اور ان کی ادبی خدمات بھی بہت قابل قدر ھیں۔ انکی بعض کتابیں مثلاً "کھاگل شاسترے مسلمان"، (ھئیت و نجوم میں مسلمانوں کے کارنامے)۔ 'بھوگل شاسترے مسلمان' (علم جغرافیہ میں مسلمانوں کے کارنامے) "بھارتیہ مسلم سبھائتا"، ھندوستان میں مسلم تمدن) بڑی محققانہ تصانیف ھیں۔ عالم السلام کے متعلق انکی معلومات اور دور جدید میں تمام عالم السلام کے حالات و تحریکات کی بابت ان کا علم بہت وسیع اور گہرا تھا جیسا کہ ان کی تصانیف 'مسلم جگاترا بھی' یو تھن' اور 'قسطنطنیہ' سے ظاھر ھوتا ھے۔ 'قرآن‌وراجنیتی' سیاسیات کے میدان میں ایک قابل قدر تصنیف ھے۔ ان کتابوں کے علاوہ ان کے اخبار 'الاسلام' میں بھی ان کے بہت سے خیال آفریں مضامین شائع ھوئے تھے۔ اس سلسلہ میں قرآن و سنت کے عنوان سے جو مسلسل مضامین شائع ھوئے وہ اس امر کی واضح شہادت ھیں کہ مذھب وجدید سائنس میں انھیں گہرا بصیرت حاصل تھی۔ مصنفین اور جدید شعرا کے طبقہ اولیٰ میں پنڈت رمضان‌الدین (متوفی

۱۹۱۹ء اور منشی مہراللہ بھی قابل توجہ ہیں اور یہ واقعہ
ہے کہ ادبی خوبیوں کے لحاظ سے وہ 'مائیکل' اور 'بنکم' کو چھوڑ کر
باقی اپنے تمام ہم عصروں سے بہت بہتر ہیں۔

مغربی تعلیم کی پیدا کردہ نئی بیداری سے جس طرح
ہندوؤں میں قومی شعور کا احیاء ہوا جیسا کہ ان کی تحریروں
سے ظاہر ہوتا ہے' اسی طرح مسلمانوں میں بھی ہوا۔ اگرچہ وہ
تعلیم میں ہندوؤں سے پیچھے تھے مگر رفتہ رفتہ وہ اپنے قومی ورثے
کے ساتھ نیا لگاؤ اور احساس فخر پیدا کرنے لگے چنانچہ اس عہد کا
بنگالی ادب مسلم قومیت کے شعور کی تجدید کے ساتھ منظر
شعور پر آنا شروع ہوا۔ یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ
انگریزی تعلیم نے مسلمانوں میں ہندویت پیدا کردی۔ مسلمان
مصنفوں کی تحریریں اس خیال کو بالکل باطل کردیتی ہیں۔
ہندوؤں اور مسلمانوں پر انگریزی تعلیم کا یکساں اثر ہوا تھا۔ اس
سے ان کو خود اپنے اوپر نظر ڈالنے اور اپنے ثقافتی سرمایے کو
جانچنے کا خیال پیدا ہوا۔ جب ان میں خود آگاہی پیدا
ہوئی تو انھیں یہ بھی محسوس ہوا کہ ان کی راہیں الگ الگ
ہیں۔ روز بروز یہ واضح ہوتا چلا گیا کہ ہندو ہندو ہیں
اور مسلمان مسلمان' اور دونوں کو ملا جلا کر ایک قوم نہیں

بنایاجاسکتا - تاریخ کے مطالعے سے انہیں معلوم ہوا کہ پندرھویں صدی کے آخر سے سترھویں صدی کے شروع تک ھندو مسلم معاشرت کو ملانے کی جو کوششیں کی گئی تھیں وہ بالکل ناکام رہی تھیں -

اس عہد میں نئے قومی جذبات پیدا ہوئے اور میر مشرف حسین سے جناب اسلام آبادی صاحب تک تمام مصنفوں نے انہیں پروان چڑھانے کی کوشش کی اور آخر کار قوم کو منزل، راہ پر لاکر رہے - ۱۹۰۴ء میں بنگال کی تقسیم مسلمانوں کی فتح تھی اور اب وہ اپنے آپکو ھندوؤں کی جلب منفعت سے محفوظ خیال کرتے تھے - افسوس کہ یہ احساس بہت جلد ختم ہو گیا کیونکہ حکومت برطانیہ نے ھندوؤں کے احتجاج سے دب کر ۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگالہ کو کالعدم قرار دے دیا -

(ج) پیشرو :

اس کے بعد مسلم بنگالی مصنفین کی جو نسل آئی اس نے اس کام کو پورا کیا جو سید مشرف حسین اور دیگر لوگوں نے شروع کیا تھا - یہ نیا گروہ سابقہ گروہ سے تعداد میں بھی زیادہ تھا اور اسکی تصانیف بھی بہتر اور پختہ تر تھیں - اس گروہ کے رئیس و سردار مشہور شاعر، ناول نگار، مضمون نگار،

مقرر اور معاشرتی کا رکن، سید اسماعیل حسین شیرازی تھے -

سید اسماعیل حسین شیرازی : یہ سراج گنج (پٹنہ)

(۱۹۳۱ - ۱۸۸۰)

میں ۱۶ جولائی ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے - افلاس کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے اس کے باوجود انہوں نے ذاتی مطالعے سے جو معلومات حاصل کیں ان سے انکی حیرت انگیز دماغی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ھے - ان کے دل میں اپنے ملک اور اپنے ہم مذھبوں کی خدمت کی بڑی للک تھی اور یہ اپنی تحریروں اور تقریروں سے برابراسی میں لگے رھے - یہ ھماری تحریک آزادی کے زبردست قائد تھے اور حکومت برطانیہ کے ھاتھوں انھوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں - یہ ایک طرف تو انگریزوں سے برسر جنگ رھے اور دوسری طرف انتہائی بہادری کے ساتھ ھندوؤں سے بھی ان کی جنگ جاری رھی - انکی نظموں کی کتاب ''انل پروارھا،، ان کی اعلیٰ ادبی خدمات کی دیرپا یادگار ھے - انھوں نے یہ نظمیں اسی بحر میں لکھی ھیں جو ھیم چندر نے ''بھارت سنگیت،، میں اختیار کی ھے - اور یہ بحر ان کے ھاتھوں میں برطانوی گولیوں سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی - اس لئے انگریز حکومت نے اگر اس کی اشاعت ممنوع قرار دے دی تھی تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی -

انھوں نے انگریزی سامراج کے خلاف کانگریس کی پیروی میں ھندوؤں کے دوش بدوش جنگ کی مگر ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی بڑی محبت تھی ۔ جب ترک جنگ بلقان ھار رہے تھے تو یہ کانگریس کے صدر ڈاکٹر انصاری کی کمیٹی میں مل کر ترکی کی جانب سے لڑنے گئے اور ترکی میں دو سال مقیم رہے وھاں ان کی بڑی قدر و منزلت اور تعریف ھوئی ۔ سلطان نے ان کو ایک خلعت دیا اور غازی کے خطاب سے سرفراز کیا ۔ انھوں نے دربار شاھی میں جب روانی کے ساتھ ترکی میں شکریہ ادا کیا تو لوگوں کو حیرت ھوگئی ۔ انکی ترکی یاد داشتیں "نرگشا برھمن" نامی ایک دلچسپ کتاب میں درج ھیں ۔

اگرچہ انھوں نے غریبانہ زندگی بسر کی مگر دراصل یہ مفلس نہیں تھے ۔ ان کی فیاضی ایشور چندر سے بھی زیادہ تھی جو "مہربانی کے سمندر" کہلاتے تھے ۔ انہیں اپنی کتابوں سے بہت آمدنی تھی مگر اسکا زیادہ حصہ غربا کو ملتا تھا ۔ یہ تعلیم نسواں کیلئے بھی زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے ۔ انکی "اسری لکھیا" (تعلیم نسواں) صرف کسی عالم کے خیالی حالات نہیں بلکہ اس عہد کی زندگی کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے جو

انکے قول و عمل میں موجود تھی ۔ انکی بہت سی کتابیں ہیں مثلاً :
انل پرواھا (قصہ) رائے نندینی ۔ (تاریخی ناول) نورالدین
(ناول) تارا بائی (ناول) فیروزہ بیگم (ناول) ترشکا برعمن
(سفر نامہ) استری شکھا (مضمون) سنگیت سنجیونی (غنائی
نظم) پریم انجلی (غنائی نظم) اسپین وجے کاویہ (رزمیہ ،
فتح اسپین) سچنتا (مضمون) گورو کہانی (رزمیہ ؛
ادب قاعدہ شیکھا (آداب مجلسی) اسپنا مسلم سبھائتا (تاریخ
تمدن) مہا شکشا کاویہ (غیر مطبوعہ رزمیہ) ۔

یعقوب علی چودھری (۱۸۸۶ — ۱۹۴۹) :

یہ موضع مگورا زلندی تھانہ
بنگشا ضلع فریدپور میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے ۔ یہ بڑے
ہونہار طالبعلم تھے مگر بی ۔ اے کے بعد خرابئی صحت کی
وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے کچھ برسوں تک چکدوں
کے ایک اسکول میں ٹیچر رہے مگر ۱۹۲۰ء میں انہوں نے
تحریک ترک موالات میں حصہ لیا اور ملازمت چھوڑدی ۔ اس
کے بعد ساری زندگی قومی خدمت میں بسر کی ۔

ماھانہ رسالوں کے ایڈیٹر کی حشیت سے بھی یہ بہت
کامیاب رہے اور بنگالی مسلمانوں کا اخبار "کوہ نور" ان
کی ادارت میں نکلتا رہا ۔ اگرچہ یہ دراصل مضمون نویس تھے

مگر انہوں نے بعض اچھے قصے بھی لکھے ھیں ۔ بنگالی ادب سے ان کو جو محبت تھی وہ ان کی کتاب ''ونگا ساھتیہ مسلمان'' کی حسب ذیل عبارت سے آشکار ھوتی ھے :

'' تو آؤ مسلم ادب کے نغمہ سنج پرندو ، نیلے آسمان میں نغمہ سرا ھونے کے بعد یہاں واپس آؤ ۔ کاھلی اور عیش پسندی کی وجہ سے ھمارے جوڑ بند اکڑ کر رہ گئے ھیں ۔ آؤ اور ھمیں اپنے نغموں کے حیات آفریں سحر سے آگاہ کرو ۔ روز مرہ زندگی کی محنت نے ھمارے جسم اور ھمارے دماغ کا رس نچوڑ لیا ھے ۔ ھمیں نئی زندگی اور قوت عطا کرو جو صرف تمھارا جادو ھی عطا کرسکتا ھے ۔ آؤ اے کیقباد ، اے ، فضل الکریم ، مزمل حق ، آؤ ، اپنی بانسریاں اور اپنے تاشے بجاؤ اور ھمیں تازہ مسرت اور جوش کے ساتھ دوبارہ سفر پر روانہ کرو ۔ آؤ امداد الحق امداد علی ، عبدالکریم ، عثمان علی اکرام علی ، آؤ اپنی بصیرت ، اپنی سیاست ، اپنے فلسفے ، تاریخ اور سائنس کی روشنی سے ھمارا راستہ منور کردو ۔ اور آو اے جدید تعلیم یافتہ نوجوانو میں تمھیں تہہ دل سے خوش آمدید کہتا ھوں ۔ آؤ اور دنیائے ادب کو اپنے نغموں سے زندہ کردو!'' ۔

لطف الرحمن : یہ ڈاکٹر لطف الرحمان کے نام سے زیادہ معروف ھیں ۔ جیسور (۱۸۸۷ - ۱۹۳۳) :

کے رہنے والے تھے - یونیورسٹی کی تعلیم سے محروم اور زندگی بھر ہومیو پیتھی کے ڈاکٹر رہے۔ کمزور جثہ اور صحت کی خرابی کے باعث ان کی ساری توجہ لکھنے پڑھنے پر رہی -

مسلم بنگال نے ان کی طرح بلند خیال مضمون نگار بہت کم پیدا کئے ہیں - ان کی تحریریں ''مہت جیون'' 'مانو جیون'، انتا جیون' ''شکتیر جے'' (طاقت کی فتح) قابل قدر ادبی چیزیں ہیں اور ''ریحانہ'' ناول بھی بہت ممتاز طبعزاد تخلیق ہے -

محمد واجد علی : موضع بانش دھا (سب کھیڑہ) ضلع کھلنا میں (۱۸۸۸-۱۹۵۴)

پیدا ہوئے - ڈگری کے معیار تک تعلیم حاصل کی - جرنلسٹ کی حیثیت سے زندگی شروع کی - زندگی بھر افلاس کا مقابلہ کرتے رہے اور حال ہی میں افلاس اور بیماری کے دکھ سہہ کر زندگی کو الوداع کہی -

یہ بھی دراصل مضمون نگار تھے - ''مرو بھاسکر'' نامی سیرت رسول اللہ صلعم ان کی لکھی ہوئی اچھی سوانح عمریوں میں شمار ہوتی ہے - معیاری اور بول چال کی زبان دونوں پر انہیں یکساں قدرت حاصل تھی - مختلف مضامین کے علاوہ انہوں نے چند سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں - ''مہامسن محسن''

"سید احمد"۔ "عبداللطیف" اور "محمد علی جناح"۔

شیخ واجد علی: یہ موضع ھگلی کے باشندے تھے۔
(۱۹۵۱-۱۸۸۸ء) کیمبرج سے بی۔ اے۔ کیا اور
بیرسٹری بھی پاس کی مگر وطن واپس آکر سرکاری ملازمت اختیار
کرلی اور بعد میں چیف پریسی ڈینسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے
پنشن لی۔ ان کے عہد میں شاید ھی کوئی اور مسلمان مصنف
ھو جسکے پاس انکی طرح کی کسی بیرونی یونورسٹی کی ڈگری ھو۔

ادھیڑ عمر کو پہنچتے ھی انہوں نے تصنیف و تالیف
شروع کی اور بہت جلد پرمغز لکھنے والوں کی صف میں
شمار کئے جانے لگے۔ ایک عرصہ تک یہ 'وانگیہ مسلم ساھتیہ
سمتی کلکتہ، (بنگالی مسلمانوں کی ادبی انجمن) کے صدر و
روح رواں رھے۔ یہ مضمون نگاری اور افسانہ نگاری کی حیثیت
سے بنگال کے تمام مصنفین پر فوقیت رکھتے ھیں۔ بڑے زبردست
ناول نگار بھی تھے اور چند ڈرامے بھی لکھے ھیں۔ میر مشرف
حسین کے بعد سے کسی مسلمان نے اتنی چیزیں نہیں لکھی تھیں۔
ان میں سے بعض کے نام درج ذیل ھیں:

بنگلار بھویشت (بنگال کا مستقبل: مضامین کا مجموعہ) [illegible]
(کہانی) - گلدستہ [illegible] ناول [illegible]

(ڈرامہ) گلدستہ (کہانیاں) موٹر جوڑے رانچیر سفر (سفرنامہ)۔ دروبشیر دعا (درویش کی دعا، کہانی) جیونیر لیلا (لذت حیات، مضمون) آما دیر ساہتیہ (ہمارا ادب، تنقید) الکنیر دان (خدا داد عطیہ) مسلم سنسکریتر آدرش (مسلمانوں کے تمدن کا نصب العین، تنقید) اکبریر راشٹرا شادھنا (اکبر کی حکمت عملی، تاریخ) بھانگا بانشی (ٹوٹی بانسری، نظم) وچھوٹا دیر بادشاہی گلپ (بچوں کیلئے بادشاہوں کی کہانیاں) جل پری مجس (بچوں کیلئے خیالیر فردوس "آئندہ کے بنگالی" (انگریزی میں مضمون)۔ گلدستہ فارسی: ("علی گڑھ کی یادیں" (خود نوشت سوانح عمری)۔

نجیب الرحمان: نجیب الرحمان بنہ کے رہنے والے اور اسماعیل حسین سیرازی (۱۸۷۸ — ۱۹۳۵) کے ہم عصر تھے مگر ان کی فطانت کا میدان جدا تھا۔ وہ فطرتاً ناول نگار تھے اور کسی سیاسی یا معاشرتی تحریک میں شریک ہوئے بغیر ہی انہوں نے شہرت حاصل کرلی۔ انہوں نے پانچ ناول لکھے ہیں 'انورہ'۔ 'پریم سمادھی'۔ 'حسن گنگو بہار' 'گوربہرسیئے' (غریب کی لڑکی) 'دنیا آرجئی نا'۔ 'انورہ' انکی پہلی اور بہترین تصنیف ہے۔ اس میں ایک مسلم خاندان کا قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مسلم ثقافت کا جیتا جاگتا

ماحول نظر کے سامنے آجاتا ہے ۔ یہ کتاب آج بھی مسلمان
گھرانوں میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے ۔

شیخ فضل الکریم: یہ موضع کالینارا ضلع رنگپور
۱۸۸۲ - ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے ۔ اگرچہ
انکی شہرت بحیثیت شاعر ہے مگر یہ اتنے ہی کامیاب نثرنگار
بھی ہیں ۔ انہوں نے تخلیقی ادب کے سوا کبھی کوئی پیشہ
اختیار نہیں کیا ۔ پرانے رسالوں میں اب بھی ان کی بہت سی
نظمیں مل سکتی ہیں ۔ ان کی اصل قوت شاعری نظموں کے
ایک مجموعے 'پرتی ترن' (ارمغان) میں نظر آتی ہے ۔ ان کا ناول
"لیلیٰ مجنوں" ایک زمانہ میں بہت پسند کیا جاتا تھا اور
واقعی بہت اچھا لکھا گیا ہے ۔ 'چنتا و چیتنیہ' میں انہوں نے
خیال افروز باتیں لکھی ہیں ۔ "پتھو بایتھا" ان کے
افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ مگر اس میں ایک افسانہ بھی
ایسا نہیں ہے جو ایک دفعہ پڑھ کر پھینک دیا جائے ۔ متعدد
رسالوں میں ان کے بہت سے مضامین بھی شائع ہوئے ۔

قاضی امداد الحق: اس عہد کے مسلمان
۱۸۸۲ - ۱۹۲۶ء مصنفین میں قاضی
امداد الحق نے کافی شہرت حاصل کی ۔ مشرقی بنگال کے
محکمۂ تعلیم میں ایک پر مشقت عہدہ پر کام
کرنے کے باوجود وہ اپنی ادبی سرگرمیاں مسلسل جوش و

خروش سے جاری رکھ سکے - ان کا ناول ''عبداللہ،، مسلمانوں میں مغربی تعلیم سے نئی زندگی پیدا ہونے کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور بنگالی مسلمانوں کے متعلق ایک معاشرتی ناول کی حیثیت سے اب بھی قابل قدر سمجھی جاتی ہے - ''نوی کہانی،، کے عمدہ اسلوب نے ''بڑتنہ،، کی ''قصص الانبیاء،، کو بالائے طاق کر دیا - مضمون نگاری کے میدان میں ان مجموعۂ مضامین میں ''پربندھہ مالا'' بہت قابل قدر چیز ہے -

بیگم رقیہ سخاوت حسین : یہ خاتون ۱۸۸۰ء میں موضع پیرا بن
(۱۸۸۰ — ۱۹۳۲)

ضلع رنگپور میں پیدا ہوئیں - ان کے شوہر سخاوت حسین بہار میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے - ذاتی مطالعہ سے انہوں نے غیر معمولی قابلیت حاصل کرلی تھی - اپنے شوہر کی قبل از وقت موت کے بعد انہوں نے اپنی زندگی معاشرتی اور ادبی خدمات کے لئے وقف کردی - یہ تعلیم نسواں کی زبردست حامی تھیں - انہوں نے کلکتہ میں سخاوت حسین گرلز میموریل اسکول بھی قائم کیا - ''ابارودھ واشنی'' (بابہ زنجیر) میں ان کے عہد کی سوسائیٹی میں عورتوں کی خستہ حالی کا بڑا درد انگیز حال لکھا ہے اور یہ کتاب عورتوں کی حالت کو

بہتر بنانے کی موثر اپیل بھی ہے - "خواب سلطان" ان کا لکھا ہوا انگریزی میں بہت دلکش ناول ہے - دیگر دو ناول "موتی چور" اور "پدما راگ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری خواتین خطوط نویسی کے میدان میں بھی کتنی کامیاب ہوسکتی ہیں - یہ واقعی اپنے وقت کی بہترین مصنفہ اور مسلمان عورتوں میں ترقی کی راہ پر چلنے والی پہلی راہرو تھیں -

اکرام الدین : یہ اس عہد کے ایک زبردست (۱۸۸۲ - ۱۹۳۵) مصنف تھے اور بردوان کے باشندے تھے - وہ حکومت کے ایک اعلیٰ عہدہ دار بھی تھے - انہوں نے اپنے آپ کو ایک تنقید نگار، ناولسٹ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ممتاز کیا - انکی کتاب "رابندرا پرتی بھا" ایک مسلمان کے قلم سے ٹیگور کی اولین تنقیدی تحسین ہے - "کنچومالی" اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے - "نوتن" بھی ناول ہے جس میں ایک مسلمان گھرانے میں کثرت ازدواج کا افسوس ناک نتیجہ بہت واضح انداز سے دکھایا گیا ہے - "باروارِی" نام ناول کے مصنفوں میں ایک یہ بھی ہیں -

شہادت حسین : شہادت حسین موضع بندت پول (۱۸۹۳ - ۱۹۵۳) تھانہ ڈی گنگا ضلع چوبیس

پرگنہ میں پیدا ہوئے۔ اس شاعر کی اسکول کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹتا رہا مگر ابتدائی عمر ہی میں ان کی شناسائی گریش چندر گھوش' کے امرت لال باھو، ڈی، ایل، رائے وغیرہ سے ہوئی۔ یہ ایک مشہور ایکٹر بھی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکول میں پڑھاتے بھی رہے۔ مگر سنجیدگی کے ساتھ ان کا مطالعہ اس وقت شروع ہوا جب یہ 'بنگیہ مسلمان ساھتیہ سمیتی' کے کتبخانہ کے لائبریرین مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں ماہنامہ ''سواگت'' سے منسلک رہے اس کے بعد ''سماچار'' اور ''وبکی محمدی'' کی ادارت بھی کی۔ ۱۹۳۱ء میں تحریک عدم تعاون میں شریک ہوئے اور جیل بھیج دئے گئے۔ آزادی ملک کے بعد انھوں نے اپنا وطن ترک کیا اور پاکستان آئے اور ریڈیو میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۵۳ء میں عزیزوں سے ملنے اپنے آبائی گھر گئے جہاں یکا یک بیمار پڑ گئے اور ایک اسپتال میں انتقال کیا۔

یہ بہت خاموش، باوضع، خاکسار اور ادبی مشقت میں ڈوبے رہنے والے شخص تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ۲۰ ہے۔ جن میں سے حسب ذیل قابل لحاظ ہیں: شاعری میں (۱) مردنگا (۲) کپا لیکھا (۳) چترابت اور روپا حندا۔ ڈرامہ میں سرفراز خان۔ انارکلی۔ مسناذر موہ (مسند کے

نشہ) ناولوں میں ''رکتا'' - ''جوگر آلو'' - ''پاتھر ریکھا'' - ''کانتا پھول'' اور ''هیرن ریکھا'' - سوانح عمریوں میں ''زیب النسا'' - ''جہاں آرا'' - ''گل بدن'' - ان کے علاوہ سوھن بھوگ - چلبدار گلپا - بالکا جیون ، بچوں کے لئے لکھی گئی ھیں - ان کے ڈرامے نہ صرف یہ کہ بہت چابکدستی سے لکھے گئے ھیں بلکہ اسٹیج کے لئے بھی بہت موزوں اور شعریت میں ڈوبے ہوئے ھیں - ناولوں سے بھی ان کی فطانت واضح ہوتی ہے - ان کا اسلوب اپنی ایک علحدہ انفرادیت رکھتا ہے - ان کی نظمیں حسن ، نغمہ اور بیان کے جادو سے بھری ہوئی ھیں -

عہد غلامی کو جھیل کر زمانہ آزادی میں آنے والے شعرا کی تعداد واقعی بہت ہے اور اس کتاب میں ان سب کا ذکر کرنا بہت دشوار ہے جو شعرا نذرالاسلام سے عمر میں بڑے مگر انہی کے عہد کے تھے ان میں خانبہادر الحاج احسان اللہ (پیدائش ۱۸۷۸) سید امداد علی (۱۸۸۰ - ۱۹۵۶) مولانا اکرم خان (ولادت ۱۸۸۳) ڈاکٹر محمد شہیداللہ (۱۸۸۵) محبوب العالم (۱۸۹۸) محمد برکت اللہ (۱۸۹۶) قاضی اکرام حسین (۱۸۹۶) شیخ حبیب الرحمن (۱۸۹۶) غلام مصطفےٰ (۱۸۹۶) وغیرہ حضرات ھیں - اس صدی کے مسلمان اھل قلم میں سب سے ممتاز ہستی

نذرالاسلام کی ھے ' (ولادت ۱۸۹۹ء) - انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی ادبی روایات کے احیاء بلکہ مجموعی حیثیت سے بنگال کے تمام انقلابی ادب پر اثر ڈالا - ان کی آمد اس عہد کا تتمہ تھی جس کے نمائندے ٹیگور تھے اور بنگال ادب کی تاریخ میں گویا ایک نئے باب کا آغاز - یہ واقعی ایک نئے عہد کے بانی ھیں -

جدید بنگالی ادب: نیا دور

جدید بنگالی ادب جو ۱۸۰۰ء سے تشکیل پانا شروع ھو گیا تھا ٹیگور کی تصانیف (۱۸۶۱—۱۹۴۱) میں اپنے کمال کو پہنچ گیا - اس صدی کے ابتدائی پچیس سال میں کسی بنگالی کے دماغ میں یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی اھل قلم ادبی میدان کے اس طویل الحیات بطل عظیم کے اثر سے بلند ھو سکتا ھے - ٹیگور کا عہد انیسویں صدی کے آخری دو دھوں سے لیکر موجودہ صدی کے ابتدائی تین دھوں تک یعنی پچاس سال سے زیادہ پر پھیلا ھوا ھے - نذرالاسلام کی شاعری اس امر کا ثبوت ھے کہ مسلمان ٹیگور کے زبردست اثر کے مقابلے میں اپنی بھی ھستی کو قائم رکھنے اور منوانے کے اھل تھے -

نذرالاسلام: نذرالاسلام چرولیاضلع بردوان کے ایک (پیدائش ۱۸۹۹ع) قدیم قاضی خاندان میں ۱۱ جیٹھ ۱۸۹۹ع کو پیدا ہوئے - ناموافق حالات کی وجه سے انہیں اپنی تعلیم چھوڑنی پڑی مگر خاندانی روایت کے مطابق فارسی کی اچھی استعداد بہم پہنچائی - نو عمری میں انھوں نے اپنے گاؤں کے ''لیٹو،، گانے والوں کی جماعت میں شرکت کرلی اور انکے لئے گیت لکھنے لگے - بعد میں ایک نانبائی کی دوکان پر نوکری کرلی - میمن سنگھ کے ایک پولیس افسر نے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا اور انہیں اپنے ساتھ رکھا اور اسکول میں داخل کرادیا- وہ اسکول کے شریر لڑکوں میں بھی نمایاں رہے اور خصوصاً گانے لکھنے کی وجه سے بہت جلد امتیاز پیدا کرلیا - ۱۹۱۴ء میں بنگال رجمنٹ میں سپاھی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے اور کراچی تک گئے - فوج میں بھی اپنی قابلیت منواکر رہے اور حوالدار کے عہدہ تک ترقی کی - حیرت کی بات یه ہے که فوجی زندگی کے زمانے ھی میں انہوں نے راگ سیکھا- ۱۹۱۸ء میں وطن واپس آکر اپنی مشہور نظم ''ودروھی،، ''مسلم بھارت،، نامی رساله میں شائع کی اور فوراً ھی ''حوالدار نذرالاسلام ،، کا نام مشہور ھوگیا -

شاعر کی حیثیت سے انہوں نے بہت جلد ایسی حیرت انگیز ترقی کی کہ چند ھی لوگ، اسکا خواب دیکھ سکتے ھیں۔ یہ باور کرنا مشکل تھا کہ کوئی شخص ٹیگور سے اسقدر مختلف نغمہ چھیڑے اور فوراً ھی لوگوں کے دل میں جگہ پا جائے۔ جس باغ میں ٹیگور کے مدھر گیت بکھر رھے تھے وھاں نذرل یکایک قرنا پھونکتے ھوئے داخل ھوئے۔ ان کا اسلوب زندگی سے بھر پور اور انکی شاعری مردانہ تیور رکھتی ھے۔

''ودروھی،، کی اشاعت کے کچھ دن بعد انکی ادارت میں ''دھوم کیتو،، (دمدار تارا) نامی ایک اخبار شائع ھونا شروع ھوا۔ خود ٹیگور نے اپنی ایک نظم میں، جو ''دھوم کیتو،، میں شائع ھوئی، اس اخبار کے ناخدا کو تحسین و آفرین کا خراج ادا کیا ھے۔

اس میں شک نہیں کہ نذرالاسلام کے ظہور سے ٹیگور کی روشنی ماند نہیں پڑی مگر اس میں بھی شبہ نہیں کہ نذرالاسلام کا نور اس روشنی میں بھی الگ نمایاں تھا۔

نذرالاسلام نے قوم کو ایک نئی امید دی ایک نیا ولولہ، ایک نیا فخر اور ایک نیا اعتماد عطا کیا۔ اس نے قوم میں حقیقت کا ایک نیا احساس پیدا کیا اور اس قوم میں نئے

عمل کا ایک جذبہ پیدا کردیا جو خوابوں کی دنیا میں کھوئے رهنا هی پسند کرتی تھی ۔ خود ٹیگور نے اس نئے احساس کا اعتراف کیا جو نذرالاسلام نے پیدا کرلیا تھا ۔ اور اپنا ڈرامہ "بسنت" نذرالاسلام کے نام معنون کر کے اپنی قدر دانی کا اظہار و اعتراف بھی کیا ۔

نذرالاسلام کی شاعری نے بنگالی ادب کی ترقی کو ایک نیا رخ عطا کیا ۔ افلاس، عمرانی بےانصافی، اورجہالت کے خلاف اس شاعر کا ولولہ انگیز نعرہ لوگوں کے دلوں میں سما گیا ۔ جمہور سے اس شاعر کی محبت تمام ماسبق شعرا کی محبت سے بڑھی هوئی تھی، اور جمہور نے بھی اپنی محبت کے پھول اس پر اس طرح نچھاور کئے کہ اس سے قبل کسی پر نہیں کئے گئے تھے ۔ انکی ادبی تخلیقات کے بعد جو ادب تخلیق هوا اس میں بھی وهی بغاوت کی گونج ملتی هے جو اس کی شاعری میں هے ۔ روایاتی شاعری کی لطافت اور موسیقیت کی دلربائی نگاهوں سے گر گئی ۔ نئی بنگالی شاعری میں اس کے بعد متعدد اور مختلف رجحانات پیدا هوئے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ نذرالاسلام اس دور جدید کا سب سے بڑا ادبی راہ نما هے ۔

یہ جوانوں کا شاعر تھا۔ هندو مسلمان دونوں کے دلوں

میں اسکی جگہ تھی ۔ وہ مظلوم اور ستم رسیدہ انسانیت اور ان لوگوں کا حمایتی تھا " جن کے ساتھ بے انصافی کی گئی تھی ، جن کو دھوکا دیا گیا تھا اور جن کے دلوں میں ایک زمانے سے درد بھرا ہوا تھا " ۔ " شمو بادی " اور " بشیر بنشی " (زہریلی بنسری) میں انہوں نے ستم زدہ انسانوں کی حالت پر اپنے خون دل سے اشک فشانی کی ہے ۔ ان نظموں نے نہ صرف جمہور کے جذبات کو ابھارا بلکہ بنگالی شاعری میں بھی ایک نئے باب کا آغاز کیا اور اس کے بعد سے بنگالی شاعری میں بغاوت کا جذبہ تمام باتوں پر حاوی ہو گیا ۔

انہوں نے عزت نفس کی پاسداری کی اور ایک کمانڈر کے لہجے میں جمہور کو پیغام دیا کہ فرسودہ روایات ، رسم توہمات ، افلاس اور تخیف کے بندھنوں سے انسانیت کو آزاد کرائیں ۔ یہ حقیقتاً بیداری اسلام کی آواز تھی ۔ اس لحاظ سے نذرالاسلام کو اپنے پیشرووں کا صحیح ورثہ ملا تھا ۔ اسلام کمزوروں کا مذہب نہیں ہے ۔ ہمت اور مردانگی سچے مسلمان کی امتیازی خصوصیات ، ہوتی ہیں ۔ آزادی ، مساوات ، اخوت اور عالمگیر محبت اسلام کی روح رواں ہیں اسلام نسل و وطن کی حد بندیوں کا بھی قائل نہیں ۔ نذرالاسلام

کے پیشروؤں کے پیدا کردہ اسلامی ادب میں مذہبی سچائی اور
اور جوش تھا ۔ اس سے معاشرتی اور سیاسی امور میں انکی
ہوشمندانہ دلچسپی ظاہر ہوتی تھی اور ان کے ادب کو حقیقت
کی دنیا سے قریبی ربط تھا مگر اس میں شاعرانہ مواد کی کمی تھی۔
نذرالاسلام کی زبردست شعری فطانت کا یہ عالم تھا کہ وہ جس
موضوع کو بھی انگشت خیال سے چھولیتا اسے کندن کی طرح
چمکا دیتا تھا ۔ ان کے ہاتھوں اسلامی ادب ایک زندہ معجزہ
بن گیا ۔ انہی کے پیدا کردہ ادب کو ہم سچا اسلامی ادب کہہ سکتے
ہیں ۔ 'فاتحہ' دوا زدہم' محرم' کھیا پاپر ترانی، نوتن چاند، خالد'
قربانی ، حرف جیب، زاغلول، امان اللہ' وغیرہ کی طرح کی نظموں
نے اسلامی تصورات کو حیات نو بخشی ۔ بنگال میں غزل کی ابتدا
بھی انہی کا ایک اہم کارنامہ ہے ۔ اس لحاظ سے کہ انہوں نے
مسلم نوجوانوں میں صحیح اسلامی جذبے کو ابھارا اور انکے دلوں
میں آزادی کی تمنا پیدا کی ہم انہیں بنگال میں پاکستان کا
خواب دیکھنے والا پہلا شاعر کہہ سکتے ہیں۔

آزادی کے بعد کے بنگالی ادب نے نذرالاسلام کے خواب کو
حقیقت کا جامہ پہنایا ہے۔ نذرالاسلام نے اپنی نظموں میں نہ صرف
عربی فارسی کے الفاظ استعمال کئے بلکہ اسلامی خیالات کو

بنگالی میں ایک نئی زندگی دی ۔ انہوں نے ایسے استعارات استعمال کئے
جو اسلام کی روح سے قریب تر ہیں اور بنگالی شاعری میں ایک
نئی طرز کے حامل نظر آتے ہیں اور جن سے دیگر زبانوں کے اسلامی
شاہکاروں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے ۔ ایک اسلامی ماحول پیدا کردیا
جسے بنگال کے نوجوان پاکستانی شعرا آج بھی بہت پسند کرتے
ہیں ۔ تخلیقی قوت اور شعری تخئیل کی رنگا رنگی میں ٹیگور کے
علاوہ کوئی بنگالی شاعر نذرالاسلام کے برابر نہیں پہنچتا ۔ بحیثیت شاعر
انہیں جو بلند مقام حاصل ہے وہی حیثیت ان کو ایک نغمہ سرا،
گیت لکھنے والے اور جذبات انگیز ناول نویس، افسانہ اور ڈرامہ نگار
کی حیثیت سے بھی حاصل ہے ۔ اپنے پہلے اور آخری مجموعہ [illegible]
کی اشاعت کے درمیانی وقفہ میں انہوں نے [illegible]
(چنپا کی جنبش) "بھانگار گان" (بربادی کے گیت) ۔ "[illegible] بہار"
شمو بادی چت نامہ ۔ سندھو ھندول ۔ (سمندر کا ھنڈولا) ۔ چوکر
چاتک ۔ (آنکھوں کے ابابیل) چکرو باک (بگلا) ۔ زنجیر ۔
جھنیگرے پھول ۔ (بکھرے ہوئے پھول) سندھا اندھا ۔ چندر
بندو (چاند کا ٹیکا) نوتن چاند (ماہ نو) جیسے مجموعے شائع
کئے ۔ یہ سب کے سب بہت مقبول اور مشہور ہیں ۔ انہوں نے
اپنی کتاب "حافظ" میں فارسی کے اشعار اور "[illegible]" میں

قرآن کے بہترین بنگالی ترجمے کئے ہیں۔ نبتھر دان (تحفہ درد) اور کنیر بیدون (غریبوں کا درد) آزاد نظم کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ ان کے بعض ناول مرتو کھودا (موت کی بھوک) بندھن ہارا (آزاد) اور کوھی لیکا نیز چند ڈرامے مثلاً ''عالیہ'' اور ''جھلمالی'' اپنی قسم کی انوکھی ادبی تخلیق تھے اور بہت جابکدستی سے لکھے گئے ہیں۔ ''بلبل'' اور ''ذوالفقار'' کی طرح کے مجموعے نغمات کے شعری حسن کو اب بھی کوئی نہیں پہنچتا۔

ان کی ادبی زندگی کے اکیس سال یعنی ۴۱ — ۱۹۲۰ء نظموں، گیتوں، ناولوں، ڈراموں، مختصر افسانوں، مضمونوں، اور ترجموں کی مسلسل تخلیق سے بھرپور تھے۔ ان کی شاعری میں مسلم قومی گیت۔ ہندوانی گیت، ویشنو پد۔ صوفیانہ غزل۔ کہانیاں۔ قصیدے اور بچوں کے لئے تحریر کردہ ادب بھی شامل ہے۔ انکی تمام تصانیف پر انکی شخصیت کا زبردست اثر نمایاں ہے۔ تمام تصانیف خلوص جذبات اور اپنی قوم کو ابھارنے کی لگن سے بھرپور ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں وانگیہ مسلم ساہتیہ سماج کے سلور جوبلی اجلاس میں اپنا صدارتی خطبہ پڑھنے کے بعد، جو انسانوں میں باہمی محبت کی کمی کی وجہ سے مایوسانہ انداز رکھتا تھا، یہ شاعر خاموش ہو گیا اور اپنے آپ میں محو ہو گیا۔

وہ اب بھی حیات ہیں مگر دراصل ان کا ہونا نہ ہونے کے
برابر ہے ۔ کیونکہ ان کے حواس جاتے رہے ہیں ۔ اس بات سے
ہندو مسلمان دونوں کے دل افسردہ ہیں ۔ علاج کے لئے وہ
یورپ بھی بھیجے گئے مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا ۔ جو دماغ
نغموں پر نغمے تخلیق کرتا تھا وہ مردہ ہو چکا ہے مگر جسم
زندہ ہے اور حکومت پاکستان و حکومت بھارت کی دی ہوئی
پنشنوں سے جسم و روح کا رشتہ قائم رکھا جا رہا ہے ۔

نذرالاسلام کے بعد سے بنگالی ادب

نذرالاسلام کے دور کا آغاز ٹیگور کے عہد کا اختتام تھا ۔ [illegible]
مکتب ادب ختم ہونا شروع ہو گیا مگر کچھ دن اور بھی
اس کے آثار باقی رہے جو کہ عہد نذرالاسلام کے بعض ہندو و
مسلمان مصنفین کے پیدا کردہ ادب سے ظاہر ہوتا ہے ۔ اس
عہد کے مشہور ترین شاعر شہادت حسین، غلام مصطفیٰ اور
جسیم الدین ہیں ۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں جن کا ذکر
ہم اس کتاب میں نہیں کر سکتے ۔ خاص کر اس لئے کہ ہم
عام طور سے زندہ شعراء کو اس کتاب میں شامل نہیں
کر رہے ہیں ۔

غلام مصطفیٰ : پیدائش ۱۸۹[illegible]ء : [illegible] مشرقی پاکستان

کے ایک گاؤں منوہر پور ضلع جسور میں پیدا ہوئے - بی - اے ،
بی - ٹی کرنے کے بعد اسکول ٹیچر کی حیثیت سے زندگی شروع کی
اور بنگال ایجوکیشنل سروس کے ایک افسر کی حیثیت سے ریٹائر
ہو کر ڈھاکہ کے " شانتی نگر " علاقے میں آباد ہو گئے - ان
کے قلم سے نظمیں ٹپکتی رہیں - یہ نثر پر بھی اسی طرح قادر ہیں
جتنا کہ نظم پر - ایک زمانہ میں انہوں نے بنگالی شاعری میں نئے
اوزان کا بھی تجربہ کیا تھا اور اس سلسلہ میں " ستین دتا " کی
پیروی کی - انہوں نے بعض عربی بحریں بھی استعمال کرنے کی کوشش
کی - ایسی ایک نظم " نوروسی " میں شائع ہوئی تھی - موسیقی
کے لحاظ سے یہ کنزرس بھی ہیں اور گیت بھی لکھ سکتے
ہیں - ان کی شاعری پر ٹیگور کا اثر نمایاں ہے - اس کے باوجود
انہوں نے نذرالاسلام اور اپنے میں مشابہت محسوس کی اور
ان کے اسلامی گیتوں میں نذرالاسلام کا رنگ جھلکتا ہے -
یہ نغمے " ترانۂ پاکستان " نامی ایک مجموعہ میں جمع ہو گئے ہیں -

انہوں نے نظمیں - گیت - ناول - سوانح عمریاں اور
مضامین شائع کرائے ہیں - انکی شاعری کے مجموعوں میں
[illegible] ، خونی راگ ، خونی روز ، [illegible] -
نوی کہانی - بلبستان - جیسی عزیز تصنیفیں شامل ہیں -

ان کے ناولوں میں ''بھانگا بوک'' اور ''روبیر نشہ'' (حسن کا نشہ) قابل ذکر ھیں - سوانح عمریوں میں ''وشوا نبی'' (نبئی اعظم) اور ''اسلام'' و ''جہاد'' مضامین کا مجموعہ ھیں - قرآن شریف کے ترجمے میں انہوں نے نثر موزوں کا بھی تجربہ کیا ھے - وہ وقت کے سیاسی مسائل سے بھی بہت باخبر تھے اور نظریہ' پاکستان کے زبردست حامی تھے -

جسیم الدین: یہ تبنول خانہ ضلع فرید پور میں پیدا (ولادت ۱۹۰۲ء) ہوئے - کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی نے ان کو لوک گیت کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کا کام سپرد کیا - اس کام کو مکمل کرنے کے بعد یہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں بنگالی زبان کے لکچرر مقرر ھوئے اس وقت مشرقی بنگال میں صوبائی افسر اطلاعات ھیں اور ڈھاکہ میں مستقلاً آباد ھوگئے ھیں -

یہ دیہی زندگی کے بڑے رسیا ھیں اور انہوں نے دیہاتوں اور دیہاتیوں کی تصویر ایسی ھمدردی سے پیش کی ھے کہ کسی بنگالی شاعر نے ابتک نہ کی تھی - بنگال کے لوک گیتوں کو انہوں نے جو کچھ دیا ھے اسکا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا - کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ' بنگالی کے اعلیٰ پروفیسر ڈاکٹر

ڈنیش سین نے اسی وقت ان کی اهلیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا
جب یہ نوعمر ادیب تعلیم حاصل کررہا تھا۔ جسیم الدین کی
"چند ڈائریاں" هیں اور بھی ایسے هندو مسلمان علماء اور
مصنفین کے نام لکھے هیں جنھوں نے انکی همت افزائی کی تھی۔
ان کے "چلے مسافر" نامی دلچسپ سیاحت نامہ میں بھی ان کی
زندگی کے کچھ حالات ملتے هیں۔

ان کی شاعری کے مجموعوں میں "نکشی کانتھر ماٹھ"
(سنہری قرتی کا کھیت)، سوجان بادیار گھاٹ۔ رکھالی۔
بالوچر (ریتیلا میدان) دھان کھیت۔ رنگیلا ناؤ ماجھی
(رنگین ناؤ کا کھیوا) اور چند دیگر مجموعے بنگالی ادب میں گرانقدر
اضافے هیں۔ انکی نظموں کا حالیہ مجموعہ "ما گو کندنا" (ماں کا
نوحہ) زیادہ سنجیدہ قسم کا هے اور همیں اس میں وہ دیہی روح نہیں
ملتی جو ان کے پہلے مجموعوں میں هے۔ اسکا اسلوب ایسا سادہ هے
جو انکی پہلے کی نظموں میں عموماً نہیں ملتا۔ "نکشی کانتھر ماٹھ"
کا انگریزی ترجمہ The Field of the Embroidered Quilt
کے نام سے شائع هوچکا هے۔ "هاسو" اور "ایک پیسہ بانسری"
(ایک پیسے کی بانسری) جیسی کتابیں لکھکر انہوں نے بچوں کے
ادب میں بھی امتیاز پیدا کیا هے۔

"بیدیرمئی،، (سپیرن) ان کا ایک اچھا غنائی ڈرامہ ہے ۔ ان کے ایکٹ کے ڈرامے اور مرشدی' بھٹیالی ' زاری اور دوسرے لوگ گیتوں کے مجموعوں میں بہت دنوں تک یاد رکھے جانے والا ادب ہے۔

شیخ محمد ادریس علی : (۱۸۹۰ — ۱۹۴۰)

یہ شمپور ضلع ہوڑہ کے ایک امیر خاندان میں ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے ۔ زندگی کے بہت سے انقلابات سے دوچار ہوئے اور آخر کار ۱۹۴۰ء میں بالکل افلاس کی حالت میں انتقال کر گئے ۔ ان کی بیوی ان سے پانچ سال پہلے ھی انتقال کرچکی تھیں جن کے نام "امار پریا" نامی مرثیوں کا مجموعہ معنون کیا گیا ہے ۔ یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ بنگالی ادب میں اس کو ایک مستقل جگہ دی جائے ۔ یہ ان کی نظموں کی آخری کتاب تھی اس سے پہلے تین مجموعے اور بھی شائع ہوچکے تھے جن کے نام یہ ھیں ۔ "بی جشن بلوانی ۔ "مرماوانی،، (دل کی قربانی) اور "مکتی ونا" (نجات کی بین) یہ تینوں مجموعے بنگالی نوجوانوں میں بہت مقبول تھے ۔ ان کی بعد کی بعض نظموں کا لہجہ طنز کی تلخی لئے ہوئے ہے مگر زیادہ تر نظمیں غنائی روح اور دلکش اسلوب

رکھتی ھیں -

نظم نگاری کے ساتھ ساتھ انہوں نے چند ناول بھی لکھے ھیں ان میں سے ایک "بنکم دوھتیا"، بھی ہے جو بنکم چندر کی اس دریدہ دھنی کا جواب ھے جو انہوں نے مسلمانوں کے طرز معاشرت پر کی تھی - اس ناول میں ادریس علی نے بنکم چندر کے ھی انداز میں ھندو سماج کی نہایت تاریک تصویر پیش کی ہے - گویا " کھوخ انداز را باداش سنگ است" کا مصداق ھوگیا ! مسلمانوں نے اس ناول کو ھاتھوں ھاتھ لیا اور بہت سراھا - انکے ناولوں میں شوکھیر سنگسار، درویش کہانی ' نوتن باؤ (نئی بہو) آدرشا گرھنی - برہیمریر پاتھے (محبت کی راہ میں) روپیر موہ (حسن کا نشہ) شامل ھیں -

بینظیر احمد: نذرالاسلام کے پیروؤں میں - بینظیر بریمیر ۱۹۰۳ء) احمد کو خاص امتیاز حاصل ھے - انکی پیدائش موضع "المدی"، نرائن گنج ڈھاکہ کی ہے - انکی تصنیفات، بندھیر بنشی (حسن کی بانسری) "اور ویشا کھی"، میں نذرالاسلام کا اثر خاص طور پر نمایاں ہے - انہوں نے اسلام اور "کمیونزم"، نام کا ایک مجموعہ' مضامین بھی شائع کیا ہے -

حصّہ ششم

پاکستان کا بنگالی ادب

(۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء سے)

دور حاضر

۱۴ - اگست ۱۹۴۷ء کو بنگال کی بھی تقسیم ہوئی اور اس طرح مشرقی بنگال، جسے اب عام طور سے مشرقی پاکستان کہا جاتا ہے، کثیر مسلم آبادی ہونے کی وجہ سے پاکستان میں آگیا - ادب پر اس تقسیم کے کیا نتائج نکلے، ان سطروں میں ہم اس پر اظہار خیال کریں گے -

تقسیم سے پہلے کلکتہ بنگال کا دارالسلطنت ہونے کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان کا بھی تہذیبی مرکز تھا - گویا ایک طرح سے تمام ادبی تحریکیں کلکتہ ھی میں جنم لیتی اور پروان چڑھتی تھیں - اسلئے وہ ادیب جو ادب میں اپنی جگہ بنانا چاہتے تھے، لازمی طور پر کلکتہ ھی کی ادبی مجالس سے وابستگی کی فکر کرتے تھے - غرضیکہ یہیں انہیں یا کوئی ادبی مرتبہ مل جاتا تھا یا پھر ترقی کی راھیں مسدود ھو جاتی تھیں - تقسیم کے وقت بنگال کے دونوں حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک اٹھے - اور ان فسادات کو عام طور پر بنگالیوں نے

سیاسی جنگ پر محمول کیا لیکن تقسیم کی بنیاد چونکہ قطعی نظریاتی تھی اسلئے دونوں حصوں میں تہذیب کی آئندہ ترقی پر دور رس اثرات پڑنے لازم تھے۔

تقسیم کا نتیجہ عام آبادی، اور خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں کے انخلاء کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بنگالی ہندو مشرقی بنگال سے مغربی بنگال کیا گئے کہ مشرقی بنگال کی ادبی زندگی میں ایک وسیع خلا پیدا ہوگیا۔ کیونکہ تعلیمی اعتبار سے وہ بہت آگے تھے۔ اگرچہ اس خلاء کو مولانا اکرم خاں' شہادت حسین، شوکت عثمانی اور اکبر الدین جیسے ادیبوں نے مشرقی پاکستان میں هجرت کرکے پرکردیا مگر صرف جزوی طو۔اس کے برعکس قاضی عبدالودود، همایوں کبیر اور سیدمجتبیٰ علی جیسے مشہور مسلمان ادیب یا تو پاکستان چھوڑکر چلے گئے یا انھوں نے مغربی بنگال ہی میں سکونت رکھی

یہ دور بہر حال عارضی تھا کیونکہ نوجوان لکھنے والوں کی نسل آهسته آهسته ابھر رهی تھی۔ جدید ادبی روایات کو شکل دینے میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر جوش دکھایا، اور اس طرح سابق بنگالی زبان کی تہذیبی تقسیم اب زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی جارہی ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مشرقی بنگال کی زبان بنگالی ہے اور اس طرح یہ زبان ادبی خیالات کی اشاعت کا خاص ذریعہ رہیگی ۔ اس زبان کی آئندہ ترقی واشاعت کے لئے جو تصورات پیش کئے جارہے ہیں اس سلسلے میں مختلف گروہوں نے مختلف رائیں دی ہیں لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہاں کی زبان لازماً بنگالی ہی رہیگی ، عربی ، فارسی یا اردو میں تبدیل نہیں ہوگی ۔ معتدل رائے رکھنے والے لوگوں کو یہ یقین ہے کہ مستقبل قریب میں مشرقی بنگال کی ادبی زبان مغربی بنگال کی زبان سے مختلف ہوگی لیکن یہ اختلاف کس حدتک صحیح اور موثر ہوگا اس کا انحصار اُن ادیبوں کی اہلیت اور قابلیت پر ہے جن کو ہماری قوم پیدا کریگی ۔ کیونکہ ادیب زبان میں تبدیلی پیدا کرکے دور رس نتائج پیدا کرسکتے ہیں ۔ اس حد تک تو عام طور پر اتفاق ہوچکا ہے کہ مشرقی بنگال کا ادب مستقبل میں اسلامی خیالات اور جذبات کا بھر پور نمائندہ ہوگا ۔ اس میں دراصل مشرقی پاکستان کے عوام کی امیدوں اور حوصلوں ، نظریوں ، رسوم و روایات ہی کی عکاسی ہوگی ۔ ان دنوں جو تحریریں ہمارے سامنے آرہی ہیں ان میں قوم پرستانہ رجحان کی جھلکیاں نظر آنے لگی ہیں ۔

ساتھ ھی ساتھ بنگالی ادب میں نئی روح پھونکنے اور اس کو قومی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے جو ٹھوس قدم اٹھایا گیا ھے، اس میں انتشار اور نظریاتی اختلاف پیدا کرنے کے لئے ایک گمراہ کن تحریک بھی موجود ھے۔ اس کی حمایت میں جو تحریریں سامنے آرھی ھیں اُن میں مبہم ارادوں اور مریضانہ ذھنیت کی عکاسی ملتی ھے اور خیالات و استعارات اُن کے عقیدوں ھی کی طرح الجھے ھوئے اور پرپیچ ھوتے ھیں۔

بنگالی زبان کی ترقی کی نشانی ایک یہ بھی ھے کہ نثر کی طرف توجہ بڑھ رھی ھے۔ اس سے پتہ چلتا ھے کہ ھماری قومی زندگی کو ابھی ایک آھنگ کی تلاش ھے جو ابتک قائم نہیں ھونے پایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شعرا جو صرف روایتی عروض و اوزان کی پابندی کو اپنا فرض سمجھتے ھیں ان سے نوجوان ذھن مطمئن نہیں ھوتے، ساتھ ھی یہ بھی دیکھا جاتا ھے کہ منثور شاعری پر، جو آجکل بہت مقبول ھے، قدیم لکھنے والے ناک بھوں چڑھارھے ھیں اور اس طرح دونوں نسلوں کے درمیان خلیج وسیع ھوتی جارھی ھے۔

ھم بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتے ھیں کہ آج کے ادب میں عوام کی زندگی اور ان کے جذبات و احساسات کی جس حدتک

عکاسی ی جارھی ھے اتنی کبھی نہیں ھوئی تھی - آج ان تحریروں میں بھوک اور دکھ درد کی تصویریں تو ملتی ھیں لیکن محبت اور روا داری سکھانے کی بجائے ان کے اندر نفرت کا رفرما ھے۔ بعض نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی بیشتر تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ھوگا کہ ان کے اندر ادب کو سیاسی پروپیگنڈا ذریعہ بنانے کا رجحان برابر پرورش پا رہا ھے۔

(ا) شاعری

فرخ احمد : ھیئت اور اسلوب میں نت نئے تجربے کرنے کی وجہ سے انہوں نے کافی شہرت حاصل کی ھے۔ خصوصاً یہ دو بھائی بوتھی ادب کے پرستار نظر آتے ھیں اور اس ادب کو انہوں نے اپنی رزمیہ نظم ''جھنجھٹی'' میں پیش کرنے کی کوشش بھی کی ھے۔ ''سات سا گر پرمانجھی'' (سات سمندر کے مانجھی) اور ''آزاد کرو یا نسان'' جیسی نظمیں لکھ کر آزادی سے پہلے ھی انہوں نے شہرت حاصل کرلی تھی۔ آزادی کے بعد 'سراج منیرا' 'نصیحت نامہ' 'تصویر نامہ' وغیرہ جیسی نظمیں لکھیں۔ ان میں بھی ھیئت کے نئے نئے تجربے کئے گئے ھیں۔

محی الدین : آپ دراصل نذرالاسلام کے انقلابی اور ادبی ھمعوکار ھیں۔ ان کی شہرت کی دلیل وہ ممتاز ادبی

رسالے ھیں جن میں ان کی تخلیقات شائع ھوتی رھتی ھیں -

احسن حبیب: آزادی سے بہت پہلے 'راتڑی شبش' (ڈھلتی رات) لکھ کر انھوں نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی - لیکن ادھر انھوں نے جو نظمیں لکھی ھیں سب کی سب طنزیہ ھیں جن میں 'دھن باد' (شکریہ) 'سندھی امن' (معاھدۂ امن) 'اقرار نامہ' اور 'حق نام 'بھروسہ' بہت مشہور ھیں - حال ھی میں انھوں نے بعنوان "برہم" جو نظم لکھی ھے وہ اسلوب کے اعتبار سے بہت اونچی ھے - ناولوں میں "زعفرانی رنگ یانرا" (زعفرانی رنگ کی چڑیا) ممتاز حیثیت رکھتا ھے -

سید علی احسن: آزادی سے پہلے انھوں نے چند نظمیں لکھی تھیں لیکن اب وہ ناقد اور مقالہ نویس کی حیثیت سے زیادہ ابھر رھے ھیں - حال میں انھوں نے صرف منثور نظمیں لکھی ھیں - ان کی تصنیفات یہ ھیں: 'پرارتھنا' (عبادت) 'کویا لوک' (جہان شعر) 'سنکٹ' (خطرہ) 'سنگباد' (خبریں) - انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ھے کہ زندگی کے موجودہ ارتقائی دور میں قوم کی ادبی سرگرمیوں کو پاکستان کے استحکام کی طرف موڑ دینا چاھئے - کیونکہ بقول ان کے "اپنی نئی مملکت کا استحکام اور بقا ادب سے کہیں زیادہ ضروری چیزیں ھیں" - مزید برآں

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مشرقی بنگال کے ان گنت پوتھی ادب
یعنی "عوامی کہانیوں" گیتوں اور نغموں کے علاوہ ہمارا ادبی
ورثہ خاص طور پر اسلامی روایات سے معمور ہے۔ لیکن انہیں
اس بات کا بھی دکھ ہے کہ "پوتھی ادب" سے معدودے
چند شاعروں نے ہی استفادہ کیا ہے۔ مستقبل میں ایسی شاعری
کی سخت ضرورت ہے کیونکہ تب ہی جدید اور سچے پاکستانی
ادب کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے"۔ (بنگالی "ماہ نو" اگست ۱۹۵۱ء)

صدرالدین: ان کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔
(۱) پیغام اور (۲) ایک پھالی چاند (چاند کا ایک حصہ)۔
ان مجموعوں میں ان کی صرف آزاد نظمیں ہی شامل ہیں۔ آپ
بھی پاکستان کے قومی جذبات سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔

شیخ سیف اللہ: سن و سال کے لحاظ سے آپ بالکل نوجوان
ہیں اس کے باوجود باؤل، مرشدی اور معرفتی ادب کی قدیم
روایات کے پیرو کار نظر آتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک ان
کی نظموں کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ
ہیں: 'سنگیت لہری' (موج نغمہ)۔ 'گل باغ'۔ 'دل باغ'۔
'اشرو دھارا' (آنسوؤں کی دھارا) 'نو جیبن' (ہمہ) اور 'جھنکار'۔
آپ شاعر ہونے کے علاوہ موسیقار اور نغمہ گر بھی ہیں۔ تعلیم کچھ

زیادہ نہیں پائی مگر فطرت نے انہیں اپنے جواہر سے خوب سنوارا ہے - ان کے اندر مصلحانہ جوش و خروش ہے مگر شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں دیتے -

اشرف صدیقی: انہوں نے ''طالب ماسٹر'' جیسی شاہکار نظم لکھ کر شاعر کی حیثیت سے کافی بلند مرتبہ حاصل کیا - ''نوتون کویتا'': (جدید نظمیں) کے نام سے انہوں نے نظموں کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا ہے جو قابل تعریف ہے -

ابو الحسین: آسمان شاعری پر دمکتے ہوئے اس تارے نے اقبال کی نظموں کے تراجم پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا - ان کی جو تین نمائندہ تصنیفیں ہیں وہ منثور نظموں پر مشتمل ہیں - ان کے نام یہ ہیں: (۱) مہہ مر جنے (سہدی کے لئے) - (۲) مدھیا براچیا (مشرق وسطی) اور (۳) آمار سونار دیس (ہمارا سنہرا دیس) - اس کے علاوہ انہوں نے ''نوابسنت (نئی بسنت)'' وغیرہ میں مقفی شعر کی طرف بھی قدم اٹھایا ہے -

روشن یزدانی: انہوں نے گیتوں میں ''سمن سنگھ'' کی بول چال کو پیش کیا ہے - ''چندر بی بی'' اور ''بجرا قوم'' ان کی مشہور نظمیں ہیں -

بیگم صوفیہ کمال : آپ مشرق بنگال کی ممتاز ترین شاعرہ ہیں۔ ’’سانجھیرمایا‘‘ (شام کی مایا) اور ’’مایا کاجل‘‘ ان کی نظموں کے مجموعے ہیں اور دونوں بہت مقبول ہیں۔

محمودہ خاتون صدیقہ : یہ بھی ایک مشہور شاعرہ ہیں۔ ان کی پہلی نظم ’’پشارینی‘‘ (دکان میں بیٹھنے والی لڑکی) ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہوئی تھی جو بیحد مقبول ہوئی۔ ان کی بیشتر نظمیں آزاد بحروں میں ہیں۔

شاعرات میں شاہدہ خانم، جہان آرا آرزو، لطیفہ رشید اور لطیفہ حق کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کے اندر بھی خاص ادبی صلاحیتیں ملتی ہیں۔

(ب) ناول اور مختصر افسانہ

ناول نگاری اور مختصر افسانہ نویسی، یہ دو اصناف بنگالی میں سب سے زیادہ پھل پھول رہی ہیں۔ لہذا موجودہ ذہنی رجحان کو سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ویسے تو مشرقی پاکستان میں بیشمار ادیب ہیں لیکن ان میں سے مندرجہ ذیل صرف چند ادیبوں نے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔

شوکت عثمان : داستان گو ادیبوں میں شوکت عثمان کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ ان کے ناولوں اور مختصر

افسانوں میں سماجی برائیوں کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ
تہذیبی انقلاب بھی ملتا ھے۔ ان کے اس قسم کے افسانے
"جونو آپا" اور "سبق کہانی" مجموعوں میں شامل ھیں۔
افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ ان کے دو ناول بھی شائع ھوئے
ھیں۔ "بیدی" (چبوترہ) اور "بنی آدم"۔ دونوں میں
سماجی برائیوں کا نقشہ پیش کیا گیا ھے۔

علاالدین آزاد: اپنے افسانوں میں باریک بینی اور
چابک دستی کی وجہ سے انھوں نے خاص شہرت حاصل کی ھے
ان کی یہ خصوصیات افسانوں کے مجموعے "مرگ نابھی" (مشک)
"دھان کنیا" (کسان کی بیٹی)، "انو موکھ" (دوسرا چہرہ)
اور "جیگے آچی" (جاگتے ھیں) میں بدرجہ اتم پائی جاتی ھیں۔

ابو رشد: نوجوان لکھنے والوں کی صف میں خاصے
مشہور ھیں۔ عوام سے ان کا رابطہ نہ ھونے کی وجہ سے ان کی
تحریروں میں شہر کی فضا رچی بسی ھے۔ ان کی تصنیفوں
میں "پراتھم جوبن" (نئی جوانی) "سامنے نوتن دن" (آگے
نیا دن) اور "ایلو میلو" (منتشر) کو ممتاز حیثیت حاصل ھے۔

بلبل چودھری: (۱۹۱۶-۱۹۵۳): رقاص کی حیثیت
سے تو انھیں بین الاقوامی شہرت ملی، افسانہ نویس اور

ناول نگار کی حیثیت سے بھی ان کو بلند مرتبہ حاصل ہے۔ ان کا ناول 'براچی' (مشرق) اچھی تصنیف ہے۔ آپ چاٹگام کے موضع سات کنیا میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں انتقال کیا۔

نورالنہار: افسانہ نویسی اور شاعری دونوں میدانوں میں آنہیں مسلمہ شہرت حاصل ہے۔ ان کی تحریریں فلسفیانہ ہونے کی بجائے رومانی ضرور ہیں مگر ہیں بیحد نتھری ستھری اور پختہ۔ ان کے افسانوں میں 'اساڑھ' 'بوبا ماٹی' (گونگی مٹی) "لیفڑبال" اور "فردا مافک" (موافق فہرست) بہت مشہور ہوئے۔

سید ولی اللہ: اگرچہ افسانہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی لیکن "لال سالو" جیسا کامیاب ناول لکھ کر اس میدان میں بھی مشہور ہوئے۔

اکبر حسین: آپ ویسے تو ایک چابک دست ناول نگار ہیں لیکن "کی پائنی" (کیا نہیں ملا) "مہو مکنی" (عظیم آزادی) اور "ابان چینا" جیسے کامیاب افسانے لکھ کر آپ نے افسانہ نویس کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی ہے۔

(ج) ڈرامہ

مشرقی پاکستان میں ڈرامہ نگاری پہلے ہی مقبول ہو

جکی ہے اور مستقبل تو بہت ہی شاندار نظر آرہا ہے۔ البتہ مستقل اسٹیج اور پیشہ ور اداکاروں کی عدم موجودگی کی وجہ سے راہیں تنگ ضرور ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یونیورسٹیوں اور نیم سرکاری اداروں نے اس فن کو زندہ رکھا ہے۔ تقسیم کے بعد سے جو کامیاب ڈرامہ نگار نظر آرہے ہیں ان کے نام یہ ہیں:

شوکت عثمان، نورالمومن، عسکر ابن شیخ، نذیر احمد، اکبر الدین، ابراہیم خلیل اور عبدالحق۔ شوکت عثمان کے یہ ڈرامے بہت پسند کئے گئے ہیں: "تسکرو لشکر" (تسکر اور لشکر)، "آملار معاملہ" (عملے کا مقدمہ)، "بغدادیر کوی" (شاعر بغداد) اور "کنکرمانی" (کنکر اور ہیرا)۔

عسکر ابن شیخ کے ڈراموں میں "برودھ" (مخالفت)، "پدا نیکشپ" (قدم رکنا) اور "بدروہی پدما" (باغی پدما) بہت اچھے ڈرامے جاندار اور کامیاب تخلیقات ہیں۔ نورالمومن کے ڈرامے "روپانتر" (تبدیلی) اور "نیمیسس" بہت خوب ہیں۔ ڈراموں میں ظرافت و مذاق کے علاوہ اسلوب میں پختگی پائی جاتی ہے۔ اکبر الدین نے "نادر شاہ" اور ابراہیم خلیل نے "سکندر" اور "موسیٰ" جیسے تاریخی ڈرامے لکھے ہیں۔ عبدالحق نے "ڈاکٹر جی"، "جوڑ کار بندی" (فتح جوڑا) ...

اور "ائی پارکے" (اس پارک میں) جیسے ڈراموں میں نئی زندگی کے مسائل بیان کئے ہیں۔ نذیر احمد فلم پروڈیوسر اور نقاد ہونے کے علاوہ ممتاز ڈرامہ نگار بھی ہیں۔

(د) انشاپردازی اور صحافت

ایسے بہت سے ادیب موجود ہیں جو انشا پردازی اور اور میدان صحافت میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی تحریروں سے مشرقی پاکستان کا ادب بہت زیادہ مستفید ہوا ہے۔ اس سلسلے میں چند ہی کا ذکر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ عبداللہ المفتی اور عبدالجبار نے مشرقی پاکستان کو سائنسی ادب کا خزانہ دیا۔ ان کی حالیہ تصنیفات یہ ہیں: (۱) وشوا رھاشیہ سندھان (رازھائے عالم کی تلاش میں) اور (۲) وشوا رھاشیہ نیوٹن و آئنسٹائین (راز ھائے عالم: نیوٹن اور آئنسٹائین)۔ محمد عبدالقاسم، محمد اشرف اور عبد الغفور نے اسلام کے معاشی نظام پر قابل تحسین مضامین لکھے ہیں۔ ادبی اور علمی موضوعات پر فردوس خاں اور صدر الدین نے ناقدانہ نظریں ڈالی ہیں۔ علم الصوت پر عبد الحق کے مفید مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ مفضل حیدر چودھری، سید علی احسن، احمد شریف اور منیر چودھری کا

شمار بھی مشہور و معروف ادبی ناقدوں میں ہوتا ہے۔

صحافت نگاری کا میدان بہت وسیع اور ہنگامہ خیز نظر آرہا ہے۔ ماہنامہ 'محمدی' اور 'سوغات' جو کبھی کلکتہ سے شائع ہوتے تھے ڈھاکہ منتقل ہوگئے ہیں۔ اگرچہ 'دلربا' 'امروز' اور 'ماہ نو' کی اشاعت بہت بعد میں ہوئی لیکن ان کی ساکھ بھی جم چکی ہے۔ روزناموں میں 'آزاد' 'اتحاد' 'ملت' اور دوسرے اخبارات و جرائد ہیں ہفتہ واروں میں 'قافلہ' 'جوگیردیوی' اور 'سینک' اور دوسرے اخبارات ڈھاکہ سے شائع ہو رہے ہیں۔

چند کہنہ مشق لکھنے والے

اب بھی چند ایسی پرانی ادبی شخصیتیں موجود ہیں جو آزادی سے بہت پہلے نمایاں مقام حاصل کر چکی تھیں لہذا انہیں دو ادوار کا نمائندہ کہنا بجا ہوگا۔ ادب کو انہوں نے جو کچھ بخشا ہے وہ لازوال اور بیش قیمت ہے۔ چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

عبدالغفور صدیقی: ان کی ۸۰ سال کی عمر ہوچکی ہے لیکن وہ اب بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کا قلم بو تینی ادب اور تاریخی تحقیقات میں خوب چلتا ہے اور یہی ان کے محبوب موضوعات بھی ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب "وسند سندھوز

انبھاسک ناٹ بھوبی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے جو بہت ھی قیمتی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

مولانا اکرم خاں: بیک وقت سیاست داں، ادیب اور صحافت نگار ہیں۔ انہوں نے صحافت کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کو پاکستان اور مغربی بنگال دونوں ھی نہیں بھلا سکتے۔ اس کے علاوہ ''مصطفیٰ ا جرت'' اور ''پارۂ عم'' کی تفسیر لکھ کر انہوں نے ادب میں بے مثال اضافہ کیا ہے۔ مذھب پر انہوں نے ایک اور قیمتی کتاب مکمل کی ہے جس کا نام ''سمسیا او سمادھان'' (مسئلہ اور اس کا حل) ھے۔

ڈاکٹر محمد شہید اللہ: ویسے ھیں تو ماھر لسانیات لیکن ان کا قلم ترجموں، افسانوں، تحقیقاتی کاموں، تنقیدوں اور تاریخی موضوعات پر بڑی کامیابی سے چلتا ہے۔ آپ ایک عرصہ سے لکھ رہے ھیں اور تاریخ ادب کو انہوں نے بہت کچھ دیا بھی ہے۔ ''بنگلہ ساھتیر کتھا'' (بنگلی ادب کی باتیں) اور ''ودیاپتی ناٹک'' ان کی حالیہ تصنیفات ھیں جو ادبی کام کرنے والوں کے لئے بہت قیمتی ھیں۔

ابراھیم خاں: انہیں تخیلی افسانوں اور سفر ناموں میں مساوی مہارت حاصل ہے۔ سب سے پہلے ڈرامہ نگر کی

حیثیت سے انھوں نے ادبی میدان میں قدم رکھا۔ "کمال پاشا"
اور "انور پاشا"، جیسے ڈرامے لکھ کر انھوں نے لازوال شہرت حاصل
کی لیکن اب افسانے اور سفر نامے لکھ رہے ھیں۔ حال ھی میں
انھوں نے ایک ڈرامہ لکھا ھے جس کا عنوان ھے "قافلہ"۔
آپ انشائیہ بھی لکھتے ھیں جس میں مکالمہ کا اسلوب بڑا صاف
ستھرا ھوتا ھے۔ "ھیرک هار" (ھیرے کا ھار) کتاب سے
ان کی ذھانت و فطانت کا اندازہ لگایا جاسکتا ھے۔

محمد برکت اللہ: آپ مشہور انشاپرداز ھیں۔
ان کا اسلوب بڑا ھی نتھرا ستھرا ھے فارسی ادب پر انھوں نے
جو کتاب لکھی ھے اس کا نام "پارسا پراتیبھا" (ایران
کا ادب) "مانوشر دھرم"، (انسان کا مذھب) ان کی فلسفیانہ
تصنیف ھے۔ آج بھی آپ مسلسل مضامین لکھ رہے ھیں۔

بیگم شمس النہار: مشرق پاکستان میں جتنی نثر
نگار خواتین ھیں ان میں ان کا درجہ بہت بلند ھے۔ آزادی
سے پہلے ھی ان کی تصنیفیں منظر عام پر آچکی تھیں۔ ان
تصنیفوں سے انھیں بڑی شہرت ملی۔ ان دنوں آپ سفر نامے
مرتب کررھی ھیں۔

ابوالفضل: آپ ایک مشہور افسانہ نویس اور ناول

نگار ہیں ۔ ڈرامہ نگاری میں بھی آپ نے اپنے جوہر دکھائے ہیں ۔ آپ کئی تصنیفوں کے مالک ہیں ۔ آزادی سے پہلے ان کے افسانوں کا مجموعہ ''عائشہ'' اور ایک ڈرامہ ''قائداعظم'' شائع ہوچکا ہے ۔ آج بھی ان کا قلم تیز رو گھوڑے کی طرح دوڑ رہا ہے ۔ ناولوں میں ''چوچیر'' (شکستہ) اور ''جیون پاتھیر یاتری'' (راہ حیات کا مسافر) ' اور ڈراموں میں ''ایک نئے ساکل'' (ایک صبح) اور ''براگتی'' (ترقی) بہت مشہور ہیں ۔

ابوالمنصور احمد: اگرچہ انہوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن طنز نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت مسلم ہوچکی ہے ۔ ''آئینہ'' اور ''فوڈ کانفرنس'' ان کی طنزیہ تصنیفات ہیں ۔ ان کے علاوہ انہوں نے حال ہی میں ایک ناول بھی لکھا ہے جس کا نام ہے ''ستیہ ستیہ'' (حقیقت حقیقت) ۔

بندے علی: آپ بیک وقت شاعر' ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں ۔ آپ بچوں کے لئے بھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں ۔ چند ناولوں کے علاوہ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ ''مینا متی چر'' (مینا متی کی زرخیز زمین) کے نام سے شائع ہوا ہے ۔

قادر نواز: یہ بھی ایک مشہور شاعر ہیں اور ان کی نظموں کا مجموعہ ''مارال'' (ہنس) شاعری کا بے مثال نمونہ ہے۔ آپ کی نظمیں بلند پایہ ادبی رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ خیالات کے لحاظ سے آپ بڑے قوم پرست ہیں اور پاکستان کے نظریات پر بڑا پکا اعتقاد رکھتے ہیں۔ انہوں نے 'ھارانو ٹوپی' (گم شدہ ٹوپی) کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی تھی۔ ایسی نظم بنگالی زبان میں کم ہی لکھی گئی ہے اور یہی وجہ تھی کہ ٹیگور نے بھی اس نظم کو اپنے اس انتخاب میں شامل کیا ہے جس میں مختلف شعرا کی چیدہ نظمیں دی گئیں تھیں۔

عبدالقادر: شاعر، ماہر عروض اور نقاد۔ آپ ایک ادبی جریدے ''ماہ نو'' (بنگلی) کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ ان کی تحریروں میں شعری کیفیتیں ملتی ہیں۔ ''دلربا'' ان کی نظموں کا قابل تعریف مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے قدیم و جدید بنگالی شعرا کی نظموں کا جو گلدستہ ''کویہ ملنچا'' کے نام سے شائع کیا ہے اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ حال ہی میں ''بیتھی'' (قسمت) کے نام سے بھی نظموں کا ایک اور گلدستہ مرتب کیا ہے جس میں تحریک آزادی اور پاکستانی نظریہ پر بعض نظمیں شامل ہیں۔ اس تصنیف

سے ان کی ناقدانہ اہلیت کا مزید ثبوت ملتا ھے ۔ اس کے علاوہ آپ وقتاً فوقتاً نظمیں اور محققانہ مضامین بھی لکھتے رہتے ھیں ۔

محبوب العالم: اگرچہ انھوں نے چند ناول بھی لکھے ھیں لیکن ھیں دراصل افسانہ نویس ۔ آپ گاہ گاہ تاریخ کے قصر معلیٰ میں بھی جانکلتے ھیں۔ ان کی معرکہ الآرا تصنیف ''مومنیر زبان بندی'' (مومن کی شہادت) ھے جسے ھم ناول تو نہیں البتہ سوانح کہہ سکتے ھیں ۔ ان کا ایک طویل افسانہ ''مفیضن'' بھی بہت مشہور ھوا ۔ '' تعزیہ '' اور ''پانچ آنے'' ان کی نظموں کے مجموعے ھیں ۔ '' پلٹن جیونیو سمرتی'' (فوجی زندگی کی یادیں) دلچسپ کہانی اور ''گونپ سندیش'' (مونچھوں کا سندیس) اعلیٰ طنزیہ افسانہ ھے ۔

انھوں نے تاریخی کتابیں '' برما کا ھنگامہ '' اور '' چھتا گرام کی تاریخ '' بھی لکھی ھیں ۔

آخر میں یہ کہنا بجا ھو گا کہ مشرقی پاکستان کے ادب نے آزادی کے بعد سے اپنا قد و قامت بڑھا لیا ھے اور کافی وقیع ادب پیدا کیا ھے ۔ کیونکہ ھمارے جغرافیائی حدود، قومی نصب العین بلکہ زبان بھی مغربی بنگال سے مختلف اور الگ ھیں'

لہذا ہمارا ادب بھی لازماً جداگانہ خصوصیات کا حامل ہو گا اور مستقبل میں نئی روایات پیدا کرے گا۔ حالیہ رجحانات اسی کی خبر دیتے ہیں۔ تاہم ابھی اس ادب کو مزید ترقی حاصل کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو ثابت کرنے کے لئے کچھ اور مہلت ملنی ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی دوسرا نذرالاسلام پیدا ہو جائے جو ادبی ترقی کے دھارے کو کسی نامعلوم سمت میں موڑ دے اور اسکی رفتار کو تیز تر کردے۔

*

مطبوعہ پاکستان ہیرلڈ پریس (جاب سیکشن) کراچی